میرے ہمدم، میرے دمساز

اقراء صغیر احمد

دن ڈھل رہا تھا۔ شام کے گلابی آنچل کو دبیز کہر نے سرمئی رنگ دیے تھے۔ ڈھل جانے والے دن ابھرتی شب کا ملاپ یوں بھی دلوں کو نا معلوم سے احساس افسردگی و اداسی سے بوجھل کر ڈالتا ہے۔ اس کا دل پہلے ہی اس اجنبی جگہ وفضا کی اداسیوں کی گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

زندگی کے بائیس سال اس نے اپنے شہر میں گزارے تھے۔ شہر سے باہر جانے کا تصور بھی کبھی نہیں کیا تھا اور اب اچانک وہ کراچی سے ایبٹ آباد آ گئی تھی۔ پچھلے دو سالوں سے اس کی زندگی پے در پے، بہت سے حادثات سے دوچار رہی تھی۔ جس میں نمایاں ترین "حادثہ" اس کی شادی تھی اور دوسرا بڑا حادثہ شادی کے دو ہفتے بعد وہ بھری پُری سسرال کو چھوڑ کر شوہر کے ساتھ ایبٹ آباد آ گئی تھی۔

سبزے سے آراستہ چشموں و آبشاروں سے سجا قدرتی حسن سے مالا مال یہ شہر بھی باسط کے سنگلاخ ارادوں و اٹل فیصلوں میں کوئی لچک پیدا نہ کر سکے تھے بلکہ کراچی میں بے جی، بھیا، بھابی اور ماں جی کے ادب میں بیڈ روم سے باہر اس کا مزاج بہت اچھا ہوتا تھا۔ بچوں کو چھیڑتے وقت خود بھی ہنس پڑتا تھا اور یہاں آ کر وہ نرمی سے بات کرنا ہی بھول گیا تھا بلکہ کبھی مخاطب بھی کرنا ہوتا تو بہت ہتک آمیز انداز ہوتا تھا۔ وہ خواہش کرتی اس سے بہتر ہے وہ اسے مخاطب ہی نہ کرے۔

اس نے یخ بستہ کھڑکی کے شیشے سے چہرہ ٹکا کر باہر دیکھا تھا۔ سرمئی وگلابی شام کا آنچل پھسل کر سیاہ شب کی ردا بن گیا تھا۔ دھند اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ باہر تا حد نگاہ دھواں ہی دھواں بکھرا نظر آ رہا تھا۔ شیشہ برف کی سل کی مانند لگ رہا تھا جس سے ٹکا چہرہ بے حد ٹھنڈک کے احساس سے لمحے بھر میں سن ہونے لگا تھا۔ سردی کی تیز لہر اس کے وجود میں سرایت کر کے ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پیدا کر رہی تھی اور اس کے احساس واعصاب پر تکلیف سوار ہونے لگی تھی...... مگر وہ بے حس وحرکت یوں ہی کھڑی رہی خود کو اذیت دینا اس کو اچھا لگنے لگا تھا۔ دن بھر میں ایسے کئی مشاغل تھے اس کے جن کی حد تک پہنچ کر اسے محسوس ہوتا کہ اب بس وہ لمحوں میں ان کانٹوں بھری زندگی سے چھٹکارا پا لے گی۔ اس طرح خود بھی شاید سکون پا لے گی اور باسط کو بھی اس سے چھٹکارا مل جائے گا۔ یہی تو اس کی دلی مراد تھی لیکن ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا تھا۔ عین وقت پر موت خود اسے زندگی کی جانب دھکیل دیتی تھی۔ موت بھی شاید اسے پسند نہ کرتی تھی۔ باسط کی طرح وہ بھی اس کے لیے نا قابل برداشت وقبول تھی۔

شیشے سے چہرہ ٹکائے وہ تہیہ کیے کھڑی تھی۔ آج آخری سانس تک وہ یہاں سے نہیں ہٹے گی۔ شیشہ اتنا یخ ہوتا جا رہا تھا گویا باہر کی تمام ٹھٹھرتی برفیلی ہوائیں اس میں مجسم ہو گئی ہوں۔ رواں رواں سردی کی شدت سے کانپنے لگا تھا۔ رگ وجاں میں سنسناہٹ بڑھنے لگی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے درود شریف وکلمہ طیبہ کا زیر لب ورد کرنے لگی۔

"بدتمیز! اگر زندگی سے اتنی ہی بیزار رہتی ہو تو شادی سے قبل ہی کیوں نہ مر گئیں؟ اب مر کر مجھے پھنسوانا چاہتی ہو۔" اس نے ایک جھٹکے سے پردہ برابر کیا تھا پھر جس طرح وہ بے آواز کمرے میں داخل ہوا تھا اسی طرح چلا گیا تھا۔

وریشا شل ہوتے احساسات کے ساتھ اپنی ناکامی پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ایک بار پھر وہ ناکام ہوئی تھی۔

"مرنا آسان نہیں ہے۔ موت اتنی آسانی سے نہیں آجاتی۔" اس نے کڑھ کر سوچا۔ پھر اسی لمحے اندر سے ایک صدا ابھری "مرنا آسان نہیں ہے۔ موت آسانی سے نہیں آتی تو عاقب کس طرح آناً فاناً زندہ سے مردہ میں تبدیل ہو گیا؟"

وہ مضطرب سی کھڑی ہو گئی۔ آہ وفغاں کا طوفان اس کے اندر بپھرنے لگا۔ "عاقب، چچا جان، چچی اور دادی جان ایک سال کے اندر اندر تمام زمین کی آغوش میں جا سوئے تھے۔ وہ اچھے لوگ تھے نیک تھے۔ تب ہی ان کے لیے آسانی تھی اور میں......"

"کس کا سوگ منا رہی ہو...... میں زندہ ہوں ابھی۔" وہ بلی کی چال چلنے والا شخص بگڑے تیور وسخت لہجے میں کہتا اندر آیا تھا۔ وہ بوکھلا کر کھڑی ہوئی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"وہ...... میں......"

"کیا میں، خاموش۔" وہ اس کی بات قطع کر کے درشتگی سے گویا ہوا۔ اس کے انداز میں برہمی تھی۔

"گھر سے فون آنے والا ہے۔ ان سے اچھی فریش آواز میں بات کرنا۔ انہیں ذرا بھی شک نہیں ہونا چاہیے ورنہ کل ہی سب پہنچ جائیں گے میری گردن ناپنے کے لیے اور ابھی میں کسی سے بھی کوئی تعلق نبھانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ جا کر اپنا حلیہ درست کرو۔" اس نے اپنے مخصوص ہتک آمیز انداز میں کہا۔

وریشا کپڑے بدل کر آئی تو اسی وقت فون کی بیل بج اٹھی تھی جو باسط نے ریسیو کیا۔ رسمی دعا سلام کے بعد وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ اسی وقت اس کے پرسکون وشگفتہ لہجے سے کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ ایسے مہذب ونرم وملائم لہجے میں کسی کے لیے نفرتوں کے اژدھے پھنکارتے ہیں۔ تذلیل وتضحیک کی بارش کی جاتی ہے۔

"پتر! کیسی ہو؟" باسط نے ریسیور اسے پکڑا دیا تھا۔ دوسری جانب سے بے جی کی پرشفقت آواز پھر اس کے دل کو گداز کرنے لگی مگر وہ کسی مستعد چوکیدار کی طرح اس کے قریب کھڑا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں بے جی! آپ سنائیں کیسی ہیں؟"

"میں ٹھیک نہیں ہوں پتر بلکہ کوئی بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

"اوہ! کیا ہوا بے جی! سب خیریت تو ہے نا؟"

"تُو ہم سب کا دل اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ پتر بہت یاد آتی ہے تیری۔ تیرے ساتھ گزارے پندرہ دن پندرہ صدیوں کی طرح لگتے ہیں۔" بے جی کے لہجے میں اس کے لیے ستائش وفخر تھا۔ آواز بخوبی قریب کھڑے باسط تک بھی پہنچ رہی تھی۔

"ہم سب بہت شکر کرتے ہیں اپنے رب کا اس نے ہمیں ایسی ہی بہو دی جیسی ہم چاہتے تھے۔" بے جی کی پرشکر آواز پر باسط کے چہرے کے ہر زاویے سے بے انتہا کبیدگی وناپسندیدگی واضح ہونے لگی تھی۔ بے جی کے بعد ماں جی بھیا بچوں نے بات کی وہ سب ہی اس کی محبت کے گرویدہ تھے اسے یاد کرتے تھے۔ باسط کا موڈ بری طرح آف ہو چکا تھا۔ یہ سب اس کی خواہش کے برخلاف تھا۔ بھابی سے بات کیے بنا بھی وہ دھپ دھپ کرتا وہاں سے چلا گیا۔

"تم ٹھیک ہو نا وریشا؟" بھابی کے انداز میں تفکر تھا۔

"جی بھابی جان! مجھے کیا ہونا ہے...... بڑی سخت جان ہوں۔"

"گڈ تمہیں سخت ہونا بھی چاہیے۔" جواباً وہ بھی کھلکھلائی تھی۔ "باسط کمرے میں نہیں ہے؟" ان کے انداز میں یکلخت سنجیدگی در آئی۔

"نہیں۔ وہ بیڈ روم میں ہوں گے۔"

"منزہ ماریشس سے واپس آ گئی ہے۔ کچھ دنوں قبل اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب وہ یقیناً باسط سے رابطہ کرے گی یا شاید پہلے ہی کر چکی ہو تو اس کا بھروسہ نہیں ہے۔" ان کی آواز میں اضطراب وتشویش تھی۔ وہ خاموش رہی۔

"باسط پر نگاہ رکھنا، جلد از جلد اس پر اپنی محبت کی گرفت مضبوط کرو اپنی چاہت کی زنجیروں میں اس طرح جکڑو کہ وہ منزہ کی طرف دیکھنے کی بھی سعی نہ کر سکے۔" بھابی اسے کافی دیر تک مفید مشوروں سے نوازتی اور سمجھاتی رہی تھیں۔

سسرال کے معاملے میں وہ بہت خوش نصیب تھی۔ بزرگوں سے بچوں تک اسے پیار ومحبت حاصل تھا فخر واعتماد حاصل تھا۔

سسرال کے برعکس معاملہ باسط کے رویے کا جس کے نام کے ساتھ منسلک ہو کر وہ سسرال آئی تھی۔ اس نے اسے پہلی شب ہی ٹھکرا دیا تھا۔ بے وقعت وبے حیثیت کر ڈالا تھا قبل اس کے کہ وہ سوچوں کی بھول بھلیوں میں گم ہوتی۔ دروازہ کھلا پرفیوم کے مسحور کن جھونکوں کے ساتھ بلیک تھری پیس سوٹ میں نکھرا نکھرا نک سک سے تیار وہ سامنے کھڑا تھا۔

"بھابی سے اتنی دیر کیا باتیں ہوئیں؟" گویا یہاں نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی سماعتیں یہیں تھیں۔

"وہ خیریت دریافت کر رہی تھیں۔" اس نے سر جھکائے جواب دیا۔ وریشا کے انداز میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو اسے چونکاتی۔

"میں جا رہا ہوں۔ گیٹ لاک کر لو۔" ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ یہاں آنے کے بعد وہ پہلی بار گھر سے باہر نکل رہا تھا ورنہ آفس سے آنے کے بعد کچھ وقت وہ ٹی وی دیکھتے ہوئے گزارتا پھر سونے تک کمپیوٹر کے کی بورڈ اور ماؤس پر اس کی انگلیاں متحرک رہتی تھیں۔

"منزہ آ گئی ہے شاید باسط سے اس نے رابطہ کر لیا ہو۔" بھابی کی سرگوشی اس کے کانوں میں گونجی پھر اس کی یہ نک سک سے تیاری اور خلاف معمول روانگی گیٹ پکڑے ہاتھ لمحے بھر کو لرزش کا شکار ہوئے تھے۔ باسط باہر نکلتے ہوئے رک کر گویا ہوا۔

"انتظار مت کرنا۔" وہ رکا نہیں سیدھا چلا گیا۔

وہ گیٹ لاک کر کے کتنی دیر تک اس سے ٹیک لگائے کھڑی رہی۔ "انتظار مت کرنا۔" یہ جملے کسی مرد کے لیے کہہ دینے کتنے آسان ہیں جب کہ عورت کا دوسرا نام ہی صبر واستقلال وانتظار ہے۔

رات پوری طرح ماحول پر چھا رہی تھی۔ سردی کی شدت میں بھی پوری طرح اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ بیڈ روم میں چلی آئی جہاں باسط ہیٹر آن کر گیا تھا۔ ماحول میں فرحت آمیز حرارت در آئی تھی۔ وہ گہری سانس لیتی ہوئی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ عشاء کی نماز کا وضو بنانے کے لیے اس نے آستین فولڈ کیں۔ سفید ہاتھوں پر سرخ مہندی کے دلکش نقش ونگار کا رنگ ایسا ہی تھا گویا آج ہی مہندی رچائی ہو۔ انہیں یہاں آئے دو ہفتوں سے زائد ہو گئے تھے۔ آنے سے چند گھنٹے قبل بھابی نے زبردستی مہندی لگائی تھی۔ ان کے خیال میں نئی دلہنوں پر مہندی سے ہی دلہناپا آتا ہے۔ دو ہفتے گزر جانے کے بعد بھی اس کی مہندی معمولی سی پھیکی نہ پڑی تھی۔ مہندی پر جمی اس کی اداس آنکھوں میں ماضی کی جھلملاہٹ ابھری تھی۔

............*

"میں نے اور وریشا نے ساتھ مہندی لگائی تھی۔ میری مہندی کب کی دھل دھلا کر صاف ہو گئی اور اس کی مہندی ابھی تک ایسی ہی ہے۔ نہ معلوم کیا بات ہے اس کی مہندی کا رنگ بھی بڑا گہرا آتا ہے۔" رمشہ اس کے مہندی لگے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے رشک آمیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔ قریب بیٹھی دادی جان نے کہا۔

"ایسی لڑکی کو سسرال بہت محبت کرنے والا ملتا ہے اور خاوند کسی پروانے کی مانند نثار رہتا ہے اس پر۔"

"اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ بندہ پہلے ہی دیوانہ ہے بعد میں پروانہ بھی بن جائے گا۔" قریب سے گزرتے ہوئے عاقب نے سرگوشی سے کہا۔

لمحے بھر میں وہ اس سرد موسم میں پسینے سے شرابور ہوگئی۔ مہندی کے وہ گل بوٹے زہریلے کیڑے مکوڑوں کی طرح ڈسنے لگے تھے۔



گھر سے فون آیا تھا۔ رسمی دعا کے بعد امی اور ابو کا بے حد اصرار تھا کہ وہ اسے گھر بلانا چاہتے ہیں۔ تین ماہ ہو چکے ہیں اسے ایبٹ آباد آئے ہوئے۔ وہ اس کو دیکھنے کو، ملنے کو بے چین ہیں۔ بھائی بھابی ایا اور آپی سب کی خواہش یکساں تھی مگر وہ رخصت ہوتے وقت اس گھر سے یہ عہد کر کے نکلی تھی۔ انہیں اپنی جدائی کی سزا دے گی۔ باسط کی جاب کا بہانہ کر کے اس نے معذرت کرلی تھی۔ گفتگو کے دوران اسے محسوس نہ ہوسکا کہ وہ بلی کی طرح خاموش چال چلنے والا شخص کب بیڈروم سے نکل کر وہاں آن کھڑا تھا۔

"میکے سے اتنی بیزاری...... اور تمہیں یہ خوش فہمی کب سے ہوگئی کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا' میرا گھر تمہاری ذات کا مرہون منت ہے۔" بلیو جینز' وائٹ شرٹ پر میرون ہائی نیک پہنے سینے پر ہاتھ باندھے وہ اس کے قریب کھڑا تھا۔ خوب صورت سیاہ بھنورا آنکھوں میں کچھ لمحوں میں بہت روشنیاں سی جگمگانے لگیں مگر اس کے لیے حقارت وتحقیر وتمسخر تھا۔

"بے جی نے کہا تھا مجھے آپ کا ہر دم خیال رکھنا ہے۔" اس نے نگاہیں جھکا کر کہا تھا۔

"ہا...... بے جی کہیں گی تو سانس لینا بھی چھوڑ دوگی؟" وہ طنزیہ مسکرایا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ اونچا کر کے بغور دیکھنے لگا۔ وہ اس کے ہاتھ کی حدت سے سرتاپا کانپ اٹھی تھی۔ جھکی ہوئی سیاہ دراز پلکیں اس کے رخساروں پر لرزنے لگیں۔

"بے جی نے حقیقت میں چاند زمین پر تلاش کرلیا ہے مگر افسوس' تم میرا مقدر نہیں ہو۔" وہ اس کے حسین چہرے کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میرے نصیب کا چاند کوئی اور ہے جس کے پیار کی کرنوں سے میرے دل کے افق پر ہر سو چاندنی بکھری رہتی ہے جو میرے جسم میں سانسوں کی طرح سموئی رہتی ہے۔" اس کی بھاری آواز میں ایک دلکشی تھی۔ وجیہہ چہرے پر جو دکھ والم نارسائی وہجر کی گہری سنجیدگی چھائی رہتی تھی۔ وہ اب غائب رہتی تھی وہ خوش رہنے لگا تھا۔

غیظ وغضب طنز وتحقیر' بے اعتنائی ولاپرواہی صرف اس کے لیے تھی۔

"چھوڑو ان ریاضتوں کو کچھ حاصل نہ کرپاؤگی۔ میری منزل تم نہیں ہو۔ میری منزل کوئی اور ہے۔" وہ اس کا چہرہ چھوڑ کر دور ہوگیا۔ پھر ٹیبل سے کار کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔

"کوئی اور کی گردان کیوں باسط صاحب! صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ کے نصیب کا چاند منزہ ہے اور شاید وہی آپ کا مقدر بھی ہے۔"

وہ سوچتی ہوئی کھڑکی میں کھڑی ہوگئی۔ باہر سردی میں ٹھٹھرا ہوا موسم اداس تھا۔ پہاڑوں کی بلندی پر دھوپ کی زرد کرنیں سونا بکھیر رہی تھیں۔ وہاں اتنا حسن ودلکشی موجود تھی جو نگاہ ودل کو سکون بخشتی تھی لیکن اس کا دل مردہ ہوچکا تھا۔ وہ جب گھر کے سناٹے سے روح کی وحشتوں سے گھبرا کر بوکھلا جاتی تو لاؤنج کی کھڑکی میں آن کھڑی ہوتی اور شیشے سے چہرہ ٹکائے باہر ان نظاروں کو تکتی رہتی جو اسے اپنی طرح ہی اداس وتنہا دکھائی دیتے تھے۔ وہ باہر دیکھتے ہوئے ایک دم چونکی تھی۔ دور سے سبزے کے درمیان ناگن کی طرح بل کھاتی سڑک پر آف وائٹ کار دوڑتی ہوئی اس طرف آرہی تھی۔ وہ کار باسط کی تھی۔ وہ گھر سے نکلتا تھا تو گھنٹوں سے پہلے واپسی نہ ہوتی تھی اور اب ایک گھنٹے سے قبل اس کی واپسی نے اسے چونکا دیا تھا۔ تیز رفتار میں دوڑتی ہوئی کار لمحوں میں گیٹ کے پاس آکر رک گئی۔ ڈرائیونگ ڈور کھول کر باسط باہر نکلا پھر جھک کر فرنٹ سیٹ کی طرف کسی سے مخاطب ہوا تھا۔

وریشا کے دل نے دھڑک کر منزہ کا نام پکارا تھا کیونکہ کار کی فرنٹ سائیڈ پھولوں کی باڑ سے چھپ گئی تھی۔ صرف باسط نظر آرہا تھا۔ اس لمحے اس کے چہرے پر جو الوہی چمک تھی۔ لبوں پر دلنشیں مسکان وآنکھوں میں روشن چاہت کی مشعلوں سے نکلتی روشنی پتہ دے رہی تھی۔ من چاہا ساتھی ساتھ ہے۔ شاید وہ اس سے اصرار کررہا تھا کہ وہ گھر میں چلے اور شاید وہاں سے کوئی عذر مانع تھا۔ چند سیکنڈز اصرار کے بعد وہ باہر آگیا تھا۔ وریشا پردے کی اوٹ میں ہوگئی۔ لاک میں چابی گھومنے کی آواز آئی تو وہ پھرتی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ باسط بڑی عجلت میں اندر آیا تھا اور اس کی جانب دیکھے بنا ہی بیڈروم میں چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ بڑے نوٹوں کی گڈیاں جیکٹ کی جیبوں میں ڈالتا ہوا جس عجلت میں آیا تھا اسی طرح واپس چلا گیا۔

وریشا پر اس نے اچٹتی سی نگاہ بھی نہ ڈالی تھی گویا گھر میں موجود بے جان اشیا اور اس میں کوئی فرق نہ تھا۔ تذلیل وبے توقیری کی اس سے بڑھ کر کوئی حد ہوسکتی ہے؟ وہ روز اس کی بدمزاجی وسردمہری کے زخموں سے گھائل ہوتی تھی مگر ابھی کی نظر اندازی اسے کند چھری سے ذبح کرگئی تھی۔ آنکھیں فوراً ہی احساس زیاں سے بھر آئی تھیں نہ معلوم کس جذبے کے تحت اس نے پردے کی اوٹ سے جھانکا تھا۔ باسط کار ٹرن کررہا تھا۔ اس کے چہرے پر سرشاری تھی۔ اس کے کاندھے پر رکھا سفید ہاتھ مخروطی انگلیوں میں دمکتی انگوٹھیاں اور سیاہ ساڑھی کا پلو اس کے شک کو یقین دے گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے دل کٹ کر اشکوں میں بہنے لگا۔



"تم میکے کیوں نہیں جاتیں؟ عجیب ہو میرے دوستوں کی بیویاں روز پے گھروں کے چکر لگاتی ہیں۔ ایک تم ہو کبھی بھول کر بھی جانے کا نام نہیں لیتی ہو۔" ناشتہ کرتے ہوئے وہ اپنے مخصوص دل جلانے والے انداز میں گویا ہوا تھا۔ "میں تمہیں خرید کر نہیں لایا ہوں۔ بھئی میکے جاؤ۔" جگ سے جوس نکالتے ہوئے اس کے ہاتھ لرزنے لگے۔

"منزہ آگئی ہے۔ اس کے شوہر کا انتقال ہوچکا ہے۔" وہ جوس پیتے ہوئے وریشا سے کہہ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بہت گہرائی سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں جہاں ہمیشہ کی طرح ایک سکوت وبے حسی طاری تھی۔

"وہ بہت پریشان ہوگئی ہے۔ بہت دکھی رہنے لگی ہے۔ اسے سہارے کی ضرورت ہے۔" اس کی کھوجتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر کسی ملال کا عکس' حسد کا رنگ' کسی پریشانی وتفکر کو دیکھنے میں ناکام رہی تھیں' جیسے وہ کسی اور کی بات کررہا ہو۔ اس کی مردانہ انا کو اس کی یہ خاموشی وبے حسی تجسس آمیز اضطراب میں مبتلا کرتی تھی۔

شادی کی پہلی شب کو جب اس نے سخت انداز میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ اس کی نہیں بے جی (دادی) کی پسند ہے۔ ان کی خواہش پر ہی گھر میں آئی ہے۔ اس سے اس کا ایسا کوئی تعلق نہ ہوگا جس کی آرزو وہ رکھتی ہے۔ اس کی پسند اور محبت منزہ ہے اور منزہ ہی رہے گی۔ وہ چاہے جب اس سے طلاق لے سکتی ہے۔" وہ سمجھ رہا تھا دلہن بنی وہ لڑکی جو خوب صورت ارمانوں وو پیلے سپنوں کی سیج پر بیٹھی ہے۔ اپنے روپ کو سراہے جانے' پیار ومحبت کی مدھ بھری باتوں کی بجائے رد کیے جانے' ٹھکرائے جانے پر کیا کچھ نہ واویلا کرے گی' روئے گی' چلائے گی...... اس سے جواب مانگے گی کہ جب وہ کسی اور کو پسند کرتا تھا کسی من چاہے وجود کی چاہ تھی تو اس کی زندگی کیوں خراب کی؟ کیوں اپنا نام دے کر لایا......؟

وہ منتظر تھا۔

اس کی آہ وبکا کا' دہائیوں وصلواتوں کا...... لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ خاموشی سے بیڈ سے اتر کر ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئی جب سے آج تک وہ اس کی طرف سے منتظر رہا تھا اور ہر بار اس کی خاموشی ولاتعلقی اسے اس کے متعلق سوچنے پر مجبور کردیتی کہ ایسی اعصاب شکن باتوں پر کوئی ردعمل کیوں نہیں کرتی۔ مرد محبت کرے نہ کرے مگر بیوی اس کے ساتھ کسی دوسری عورت کا نام بھی سننا گوارا نہیں کرتی ہے۔ ایک وہ تھی جس کو کوئی پروا نہ تھی۔ اس کی یہ لاپروائی اسے سوچنے پر مجبور کرتی کہ کہیں وہ بھی کسی اور کو پسند تو نہیں کرتی ہے؟ یہ احساس ہی ایسا زہریلا پھنکارتا ہوا ناگ تھا جو اسے ڈستا رہتا تھا اور وہ نہ چاہنے کے باوجود اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہوجاتا تھا۔

"میں منزہ سے شادی کررہا ہوں۔" اپنے ارادے سے آگاہ کرتے وقت وہ پوری طرح اس کے احساسات کی زد میں اس کی ٹٹولتی نگاہوں کے حصار میں تھی۔

"میں نے کب منع کیا ہے......" سیب کاٹتے ہوئے اس کا ہاتھ بہک گیا تھا۔ خون کی ننھی ننھی بوندیں شفاف ہتھیلی پر نمودار ہوئی تھیں جن کو کمال مہارت سے اپنے جذبات کی طرح اس نے چھپالیا تھا۔ سپاٹ چہرے پر کوئی تاثر نہیں آنے دیا۔

"ابھی یہ کام میں پرائیویسی میں کرنا چاہتا ہوں۔ امید کرتا ہوں گھر تک تم خبر نہیں پہنچاؤگی۔" اس بار اس کی زبان ساتھ نہ دے سکی۔ صرف گردن اثبات میں ہلانے پر اکتفا کیا۔

باسط کے ذہن میں پھر شک کے ناگ سرسرانے لگے۔ وہ ادھورا ناشتہ چھوڑ کر اٹھ گیا۔ وریشا نے اس کے آفس جانے تک صبر وضبط سے کام لیا۔ ٹیبل صاف کی' کچن سمیٹا' برتن دھوئے پھر اس کے جانے تک وہ ڈسٹنگ سے بھی فارغ ہوچکی تھی۔

باسط کی موجودگی میں اندر ہی اندر گرنے والے آنسو تنہائی پاتے ہی بے قراری سے باہر نکل آئے تھے۔ چیخیں اس نے روکنے کی سعی نہ کی اور وہ خاموشی سے بیٹھی روتی رہی۔ اول روز سے وہ جانتی تھی۔ باسط اس کا نہیں ہے پھر اس کی بے اعتنائی وبے نیازی نے بھی یہ حقیقت کبھی بھولنے نہیں دی تھی۔ اس کے باوجود اندر کسی گوشے میں ایک موہوم سی آس کا دیا جل رہا تھا۔ کبھی نہ کبھی پلٹ آنے کا۔ آج وہ دیا بجھ گیا تھا۔ کبھی نہ جلنے کے لیے۔ وہ رو رہی تھی۔ بڑی شدتوں سے ہچکیوں سے روئے جارہی تھی اور ذہن میں دادی جان کی فکر انگیز آوازیں گونج رہی تھیں۔

"بہو! جب یہ اس طرح ہنسنے سے باز نہیں آتی تو اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا کرو۔ میرا دل ہول جاتا ہے جب یہ اس طرح ہنستی ہے۔" وہ اسے کھلکھلا کر ہنستا ہوا دیکھ کر اس کی امی سے مخاطب ہوئیں جو قریب بیٹھی تھیں۔

"اماں! یہ نیک کام آپ ہی کریں مجھ میں طاقت نہیں ہے۔" جواباً وہ کچھ فاصلے پر بیٹھی وریشا کو گھور کر بولیں جو رمشہ کے ساتھ بیٹھی کوئی بات سناتے ہوئے بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔ اس کی عادت تھی بات بے بات قہقہے لگانے کی۔ بات ہنسی کی نہ بھی ہو تو وہ ہنستی تھی اور اگر ہنسی کی بات ہو تو پھر اس کی ہنسی کسی بریک فیل گاڑی کی طرح بمشکل قابو میں آتی تھی اور ایسے میں دادی جان کا پارہ ہائی ہوجاتا تھا۔

"ارے کتنی مرتبہ سمجھایا ہے لڑکی! اس طرح منہ پھاڑ کر مت ہنسا کر۔ دل مردہ ہوجاتا ہے اور چہرہ بے رونق' پھٹکار برستی ہے کہیں بعد میں ایسے ہی رونا نہ پڑ جائے۔" وہ دل پر ہاتھ رکھ کر خدشے بیان کرتیں۔ چچی جان لپٹا کر کہتیں۔

"میری وریشا کے نصیب تو سب سے بلند ہیں۔"

"یہ تمہاری محبت ہے صابرہ! جو تم اس لڑکی کو بہو بنا رہی ہو ورنہ اس لڑکی میں سوائے خوب صورتی کے کوئی گن نہیں ہیں۔" امی دیورانی سے مخاطب ہوئی تھی۔

''بھابی! جب سر پر پڑتی ہے سب کام آجاتا ہے جب ذمے داریاں پڑیں گی یہ لاابالی پن و کھلنڈرا پن سب کم ہوجائے گا پھر یاد کریں گے۔'' ماضی کے دروازے اکثر وا رہتے ہیں جہاں سے یادوں کے جھونکے اپنے گزر جانے کا احساس دلاتے ہیں۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھنے لگی۔ سامنے آویزاں آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو دادی کی باتیں درست لگی تھیں۔ پھولوں کی طرح دلکش چہرہ اور ستاروں کی مانند جگمگاتی آنکھیں ماند پڑ گئی تھیں۔

گلابوں سی رنگت زردیوں میں ڈھل گئی تھی۔ امی اور دادی کی ڈانٹ پھٹکار کے باوجود بے تحاشا کپڑے لانے کی عادی تھی ہر نئے فیشن کی ابتدا و انتہا جس کی ذات کا مرکز ہوتی تھی۔ دادی کہتیں۔

''ابھی سے ایسا پہنے اوڑھے گی تو شادی کے بعد کیا کرے گی؟''

''آج آپ دیکھ رہی ہیں دادی جان! یقیناً باخبر ہوں گی۔ آپ کی یہ نکمی و نالائق کام چور اور پھوہڑ پوتی جس کو ہنسنے' قہقہے لگانے اور بے تحاشا بولنے کی عادت تھی جو گھومنے پھرنے میں خوش تھی۔ کسی انارکلی کی طرح اس شیشے و ماربل کے بنے گھر میں چن دی گئی ہے۔ اس پر وہ تمام دفعیں لاگو ہیں جو کسی خطرناک و ناقابل معافی مجرم کے لیے ہوتی ہیں۔ آج میرے لب ہنسی سے نا آشنا ہیں اور زبان گفتگو سے محروم۔ ہیئر اسٹائل بدلنا بھول گئی ہوں۔ میرے بال جو کبھی شانوں سے بھی اونچے تھے۔ آج کمر سے بھی نیچے ہیں۔ مدت ہوئی میں نے ان کو قینچی لگانا چھوڑ دی۔ آپ کو اعتراض تھا میں دن میں کئی سوٹ بدل ڈالتی ہوں اب ہفتے میں دو بار بدلتی ہوں۔ اکثر ایک سے بھی کام چلا لیتی ہوں۔ چار بیڈ روم ز لاؤنج' سٹنگ روم اور ہال پر مشتمل اس کاٹیج کی میں خود صفائی کرتی ہوں۔ کچن کی تمام ذمے داری میری ہے۔ میرے پکائے کھانوں پر باسط نے کبھی تنقید نہیں کی۔ نہ میں کہیں جاتی ہوں اور نہ کوئی میرے پاس آتا ہے۔ یہاں کاٹیجز خاصے فاصلوں پر ہیں۔ دادی جان یہ سب میرے لیے آپ کی پیشن گوئیاں تھیں یا بددعائیں؟'' وہ سسکتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

''آپ مجھے بددعائیں نہیں دے سکتیں دادی جان۔ عاقب کے بعد آپ مجھ سے بھی محبت زیادہ کرتی تھیں۔''



اس کو اطلاع دینے کے بعد وہ بالکل ہی آزاد ہوگیا تھا۔ گھر آنے کے بعد بھی وہ موبائل سے چپکا رہتا تھا۔ وہ بیڈ کی سائیڈ میں آنکھیں بند کیے ان کی گفتگو سنا کرتی۔ باسط دوسری طرف سے آنے والی پرجوش و جذباتی باتوں پر ہوں ہاں میں جواب دیا کرتا تھا۔ نہ معلوم وہ اس کی موجودگی کے خیال سے جھجکتا تھا یا وہ اپنے جذبات کے اظہار کی قبل از وقت تشہیر پسند نہیں کرتا تھا مگر دوسری جانب ایسی کوئی قید نہ تھی۔ باسط کی غیر موجودگی میں وہ گھر چلی آئی۔

''آپ کی تعریف؟'' وریشا نے گیٹ کھولا تو وہ بنا کچھ کہے بڑے طمطراق سے اندر چلی آئی تھی۔

''ہماری تعریف......'' اس نے سرتاپا وریشا کو دیکھتے ہوئے مغرورانہ لہجے میں کہا پھر اٹھلا کر بولی۔

''لوگ کرتے ہیں لیکن پھر بھی بتا دیتی ہوں۔ میں اس گھر کی اصلی مالکن ہوں منزہ۔'' ریڈ ساڑھی جس پر سلور ورک جھلملا رہا تھا۔ ویسی ہی جیولری میں اس کے بھرے بھرے نقوش والا چہرہ۔ ریڈ لپ اسٹک سے رنگین ہونٹ دلکش لگ رہے تھے۔

وہ دلربا حسن کی مالک تھی۔

''بیٹھیے پلیز۔'' لمحے بھر میں اس نے خود پر قابو پایا تھا۔

''یہ میرا گھر ہے۔ یہاں رہنے کی' بیٹھنے کی اجازت تم سے لینے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔'' ساڑھی کے پلو کو بائیں ہاتھ سے دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے وہ رعب دار لہجے میں کہہ رہی تھی۔ اس کی حاسدانہ نگاہیں وریشا پر تھیں۔ اسی اثنا میں باسط اندر داخل ہوا تھا اور اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''منزہ! تم...... یہاں؟''

''ہاں ڈارلنگ! میں نے سوچا تمہیں سرپرائز دوں۔'' وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور بڑے استحقاق سے اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کی اس حرکت پر وہ بری طرح سٹپٹا گیا۔ بے ساختہ نگاہ سامنے کھڑی وریشا پر اٹھی تھی جو خود انگلیوں کو مروڑتی ہوئی نروس لگ رہی تھی۔

''او کے بیٹھو۔'' بہت نرمی سے اس کے بازو گلے سے نکالتے ہوئے وہ مخاطب ہوا پھر ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے لگا۔

''کھانا لگا دوں؟'' گومگوں کی کیفیت میں کھڑی وریشا کے لبوں سے آواز نکلی۔ ان دونوں کے درمیان کھڑے رہنا اسے بہت دشوار لگ رہا تھا۔

''ہاں۔'' باسط نے دھیمے سے کہا تھا۔ وہ سیدھی کچن میں آگئی۔ لنچ میں چکن چیلی' مٹر پلاؤ بنایا تھا۔ سویٹ ڈش میں فروٹ ٹرائفل تھا۔ سلاد اور رائتہ سب تیار تھا۔ تمام ڈشز اس نے ڈائننگ ٹیبل پر سجا دی تھیں۔ باسط کو اطلاع دے کر وہ پھلکے بنانے لگی۔ وہ کھانے میں مگن تھے۔ دونوں میں سے ایک نے بھی اسے دعوت نہ دی تھی۔ گرم پھلکے پہنچانے جب وہ جاتی تو بڑے تحکم بھرے انداز میں آرڈر ملتا۔

''گلاس میں پانی بھرو۔ وہ ڈش اٹھا کر دینا۔ یہ روٹی کے کنارے کچے ہیں۔ ڈھنگ سے پکانا نہیں آتا۔ پلاؤ میں مرچیں تیز ہیں مٹر بھی پوری طرح نہیں گلے۔ اس سے اچھا اور ٹیسٹی کھانا میرا ایٹلر بناتا ہے۔''

کھانے کے ساتھ پوری طرح انصاف کرتے ہوئے وہ ہر عیب جوئی میں مشغول تھی۔ باسط گویا کان اور زبان گروی رکھے بیٹھا تھا۔ کھانے کے بعد کافی کی فرمائش ہوئی پھر چائے کی۔ وہ سر جھکائے ایک کے بعد ایک حکم کی تعمیل کرتی گئی۔ لاؤنج میں ان کے قہقہے و باتیں ہر سو گونج رہی تھیں۔ شام میں وہ باسط کے ہمراہ چلی گئی۔ صبر و برداشت کی پہلی انتہا تھی۔ اس کے بعد اس نے معمول بنا لیا۔ ہر دوسرے دن وہ موجود ہوتی۔ گھر کی ہر شے سے لے کر باسط پر بھرپور حق جتاتی ہوئی۔ وریشا کی خاموشی نے اس کے حوصلوں کو تقویت دی تھی جو وہ اس کو کچھ گردانتی نہ تھی۔ البتہ باسط اب اس کی روز روز کی آمد اور پھر وریشا کی درگت پر کنفیوژ نظر آنے لگا تھا۔ وریشا کو انگلی کے اشاروں پر متحرک رکھتی تھی پھر اس کے حوالے سے طنز کرنا باسط کو نروس کر رہا تھا۔ اب اس کی یہی خواہش ہوتی کہ وہ اس کے ساتھ گھر میں زیادہ وقت نہ گزارے۔

اس دن وہ آم لے کر آیا جو خوب صورت پیکنگ میں تھے اور آم دیکھتے ہی اس کے ذہن میں عاقب کی یاد اس انداز میں آئی کہ وہ دم بخود سی کھڑی رہ گئی۔

''تمہارے لیے باغ کے سارے آم لے آیا ہوں۔ کھاؤ کتنے کھاؤ گی۔'' وہ سچ مچ کئی پیٹیاں آم کار کی ڈگی میں بھر کر لے آیا تھا۔

''سچ عاقب! تم کتنے اچھے ہو۔'' اس نے پیٹی سے آم نکال کر دوپٹے سے صاف کیا اور کھانے لگی۔

''لاحول ولاقوۃ۔ سست لڑکی دھو تو لیتیں اس کو۔''

''صاف کیا تو ہے دوپٹے سے۔''

''اللہ حافظ ہے ہمارے معدوں کا۔ تم کھانا بھی اسی طرح پکاؤ گی۔''

''ہاں۔ اگر معدوں کا اتنا ہی خیال ہے تو ملازم رکھ لینا۔''

''یہ بات دادی جان کے آگے مت کہہ دینا۔''

''اتنی بدھو نہیں ہوں میں۔''

''اتنی نہیں ہو پر ہو ضرور۔'' اس نے شرارت سے چھیڑا۔

''عاقب!'' وہ غصے سے بولی۔

''جی جان عاقب!'' اس کے انداز میں محبت کے تمام رنگ تھے۔

''ایسی باتیں مت کیا کرو ورنہ...... میں تمہاری جان لے لوں گی۔''

''ضرور ضرور...... یہ جان تمہارے لیے ہے جانِ من۔'' اس نے چڑ کر آم اور گٹھلی دور اچھالی اور آگے بڑھنے لگی۔

''ناراض مت ہو یار! میں مذاق کر رہا تھا...... رکو...... سنو تو سہی آم لینے گیا تو ایک لطیفہ ہوگیا۔'' وہ رک گئی۔

''کیا ہوا؟'' انداز میں مصنوعی ناراضگی تھی۔

''میں نے ایک آم والے سے پوچھا۔'' خان صاحب! میں یہ سارے آم خرید رہا ہوں۔ انہیں پیک کردو۔''

''جھوٹے یہ کوئی لطیفہ ہے؟''

''پوری بات تو سنو۔ میری بات سن کر خان غصے سے بولے ہمیں ام سارا مال تم کو نہیں بیچے گا۔ میں نے کہا خان صاحب! میں منہ مانگے دام خرید رہا ہوں تو وہ بولا۔ تم ہمارا بات کا مطلب سمجھا نہیں۔ اگر ام سارا مال تم کو بیچ دے گا تو سارا دن کیا بیچے گا؟'' اس کی ہنسی کے بریک فیل ہوگئے تھے۔ عاقب مسکراتا ہوا اسے بے تحاشہ ہنستے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ آم کا ڈبہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

''کیا ہوا؟ تم ٹھیک تو ہو......؟'' باسط نے بڑھ کر اسے تھاما تھا۔

''جی میں ٹھیک ہوں۔'' وہ جھٹک کر اس کی گرفت سے نکلی تھی۔

''آم تمہیں پسند نہیں ہیں۔'' باسط نے ڈبہ اٹھا کر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔ میں اس کی خوشبو سے بھی چڑتی ہوں۔'' عاقب کی وفات کے بعد اسے اس پھل سے بھی نفرت ہوگئی تھی۔

''آم کا موسم نہیں ہے آپ کو کہاں سے مل گئے؟'' وہ بلاضرورت بات کرکے اپنی جھینپ کو مٹا رہی تھی کیونکہ اس کے اس چونکا دینے والے طرز عمل سے باسط الجھ گیا تھا۔ اس کی ذہین آنکھیں اسی انداز میں اس کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے اس کا ماضی جاننا چاہ رہی ہوں' عجیب کھوج تھی۔

''آؤٹ آف سیزن میں بھی مل جاتا ہے۔ انسان افورڈ کرسکتا ہو تو......'' وہ آم کا پیک شدہ ڈبہ اٹھا کر چوکیدار کو دے آیا تھا۔

آج صبح سے ہی اس کی طبیعت اداس تھی کیونکہ آج عاقب کی سالگرہ منائی جاتی تھی۔ سارا دن وہ غمزدہ رہی تھی۔ چائے اور سلائس کے علاوہ وہ کچھ نہ کھایا تھا۔ آج خلاف

توقع سارا دن باسط گھر میں ہی رہا تھا اور اسے معلوم بھی نہ ہوسکا تھا کہ وہ ہر لمحہ اس کی پُرتجسس نگاہوں کے حصار میں رہی تھی۔ رات خواب میں بھی اسے عاقب ہی نظر آرہا تھا۔ شادی کا گھر تھا۔ بارات کی تیاری عروج پر تھی۔ احمر بھائی دولہا بنے کار میں بیٹھنا چاہتے تھے مگر چابی اوپر ان کے کمرے میں رہ گئی تھی۔ وقت کے پابند تایا جان کا غصہ عروج پر تھا۔ احمر بھائی کے دوست اور دوسرے رشتے دار آتش بازی کے علاوہ فائرنگ کررہے تھے کہ آج کل ان فضولیات کے بغیر خوشیاں ادھوری سمجھی جاتی ہیں۔ اس وقت بھی یہی سب ہورہا تھا۔ وہ اوپر جارہا تھا۔ وریشا نیچے اتر رہی تھی۔ ڈارک پرپل شرارہ سوٹ پر گولڈن فینسی کام تھا۔ ہمرنگ جیولری اور مہارت سے کیے گئے میک اپ میں اس کا نوخیز حسن دو آتشہ نظر آرہا تھا۔

''اوہ..... چشم بددور..... لگتا ہے سارا میک اپ تم پر ہی ختم ہوگیا ہے۔ دلہن کے لیے کچھ میک اپ بچایا بھی ہے یا نہیں.....؟'' وہ اسے پُرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''یہ کون سا طریقہ ہے تعریف کرنے کا؟ سیدھے تعریف نہیں کرسکتے تھے۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''اوپر سے چابی لے کر آجاؤں پھر دل کھول کر تعریف کروں گا۔'' تایا جان کے غصے کا خیال آتے ہی کہتا ہوا اوپر کی جانب دوڑا تھا۔

''چابی اوپر سے ہی پھینک دو۔ ہم تمہارے ساتھ ہی جائیں گے۔''

''میرے پاس ٹائم نہیں ہے فالتو لوگوں کو لے جانے کا۔ اگر تم تنہا چلتی ہو تو ٹھیک ہے۔'' وہ ہنستا ہوا گویا ہوا۔

''تمہارے ساتھ میں تنہا جاؤں گی۔ منہ دھو رکھو۔''

''سوچ لو..... ورنہ ساری زندگی یاد کروگی۔'' اس کے شوخ لہجے میں ایسا کوئی احساس ضرور تھا جس نے لمحے بھر میں وریشا کو سہا دیا تھا پھر وہ شانے جھٹکتی ہوئی نیچے اترنے لگی۔

''رکو یار! میں چابی دے کر آرہا ہوں۔'' وہ اسے رکنے کا اشارہ کرکے بھاگتا ہوا اوپر گیا تھا۔ احمر کے کمرے سے چابی لے کر ٹیرس سے نیچے جھک کر احمر سے چھوٹے عامر کی طرف اچھالی تھی اور وہ پیچھے ہٹ ہی رہا تھا کہ فائرنگ کی زد میں آگیا۔ گولی سیدھی اس کی پیشانی میں گھستی چلی گئی۔

لمحے بھر کو سماں تھم گیا۔

وقت کی گردشیں رک گئیں۔

پھر بہت سارے منظر یکے بعد دیگرے بدلتے گئے۔ خون سے لت پت وجود کفن میں لپٹا اس کا زرد چہرہ اگربتی و کافور کی خوشبو گلاب کے پھول..... آہیں سسکیاں آنسو.....

وہ چیختی ہوئی اٹھ بیٹھی تھی۔

''کیا ہوا؟'' باسط اس پر جھکا ہوا پوچھ رہا تھا۔

''عا..... قب..... عاقب۔'' سانس اس کی دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ خوابیدگی کی کیفیت میں پکار رہی تھی۔ باسط نے لیمپ روشن کرکے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے دوبارہ لیٹ گئی تھی۔ باسط نے اس کی طرف سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

براؤن سلکی گیسو تکیے پر بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ لائٹ بلو سوٹ میں اس کے خوب صورت چہرے کی زردی نمایاں تھی۔ سیاہ پلکیں شبنمی قطروں سے تر تھیں۔ وہ خواب کی کیفیت میں جس طرح مدہوشی سے اٹھی تھی اسی بے خبری سے سو رہی تھی۔ وہ جھکا ہوا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

اس کے دل کی حالت زیر و زبر تھی۔

اس کے شکوک کو یقین کی بنیاد مل گئی تھی۔

وہ ساری رات ایک ہی فقرے کے گرداب میں ڈوبتا ابھرتا رہا تھا۔

عاقب.....

عاقب.....

''عاقب! کون ہے یہ عاقب؟'' وہ ساری رات جاگتا رہا سوچتا رہا۔ حسد و رقابت کی آگ اس کے پور پور میں سلگنے لگی تھی۔



بے جی کا فون آیا تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ ایک چکر کراچی کا لگائیں۔ چھ ماہ ہوچکے ہیں انہیں ان سے دور ہوئے۔ ماں جی تو باقاعدہ باسط سے ناراضگی کا اظہار کررہی تھیں۔ بھیا بھابی کی پیار بھری تاکید تھی کہ وہ جلد سے جلد آئیں۔ وریشا کو وہ ابھی بھی منزہ سے بچنے کی ترغیب دینا نہ بھولتی تھیں۔ وہ باسط سے منزہ کے مسلسل رابطے و تعلق سے بے خبر تھیں۔ انہیں معلوم نہ تھا وہ ماں بیٹی ایبٹ آباد میں مقیم ہیں اور ان کی منشا پر ہی باسط نے اپنا ٹرانسفر ایبٹ آباد کروایا تھا اور وہ جلد از جلد شادی کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ وہ سب ان باتوں سے بے خبر سمجھ رہے تھے کہ وہ وریشا کی محبت میں بھول گیا ہے۔ اس کے لیے حسین ترین لڑکی کا انتخاب کرنے کا مقصد یہی تھا کیونکہ زہر زہر کو مارتا ہے اور حسن حسن کو..... ان کو اس خوش فہمی اور اطمینان میں مبتلا کرنے والی وریشا تھی جس نے اصل حقائق چھپا کر انہیں اپنی اور باسط کی جھوٹی داستانیں سنائی تھیں اور انہیں فکر و اضطراب سے آزاد کردیا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ سب کی فکریں اور تکلیفیں اپنے دامن میں سمیٹ لینے والی۔ اپنے بدلے کی خوشیاں و راحتیں دوسروں میں بانٹ دینے والی۔ گداز دل حساس طبیعت لڑکی۔

''یہ کچن کے سامان کی لسٹ ہے۔'' وہ باہر نکل رہا تھا جب اس نے لسٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے ایسی شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ میرے کولیگ نے گھر داری کی تھی۔ اب وہ چھٹیوں پر ہے۔'' اس نے وضاحت دی تھی۔

''لیکن..... سامان ختم ہوچکا ہے سارا۔ ڈنر میں بنانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے۔'' اس کے انداز میں فکرمندی تھی۔

''میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ ابھی جیولر کے پاس جانا ہے۔ رات میں ہوٹل سے لے آؤں گا۔ کل میرے ساتھ چلی جانا شاپنگ کرنے۔'' وہ عجلت میں کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ وریشا دروازہ بند کرکے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ سنک میں پڑے ناشتے کے برتن دھوتے ہوئے اس کا ذہن باسط کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔

پچھلے چند دنوں سے اس کا رویہ ناقابلِ فہم سا ہوتا جارہا تھا۔ کبھی بالکل خاموش ہوجاتا۔ کئی کئی دنوں تک اس کی سنجیدگی و بے زاری عروج پر رہتی۔ وہ اس سے اکھڑا اکھڑا رہتا کہ زندگی تنگ پڑنے لگتی یا پھر اس کی نگاہیں عجیب انداز میں اپنے اردگرد محسوس کرتی جیسے وہ کچھ کھوج رہا ہو تلاش رہا ہو کوئی بے چینی کوئی سوال اکثر اس کے لبوں کے گوشوں پر پھڑپھڑا کر رہ جاتا تھا جس کو وہ کسی مصلحت کے تحت لبوں سے ادا نہ کرپاتا تھا۔

نہ معلوم اسے کیا پریشانی تھی..... کیا مسئلہ درپیش تھا جس نے اس کی راتوں کی نیندیں بھی اڑا کر رکھ دی تھیں۔ اس نامعلوم اضطراب میں وہ اپنی محبت اپنے جنون کو بھی بعض اوقات نظرانداز کردیتا تھا۔ راتوں کو آنے والی منزہ کی کال ریسیو نہ کرتا بلکہ سیل فون ہی آف کردیتا تھا جب سے آکر اس نے وریشا کو تنگ کرنا شروع کیا تھا تب سے باسط نے اس سے باہر ہی ملنا جاری رکھا تھا۔ وہ گھر کی خواہش ظاہر بھی کرتی تو وہ کسی نہ کسی بہانے سے روک دیا کرتا تھا۔

چھ ماہ کے عرصے میں پہلی بار اس نے اسے باہر لے جانے کی بات کی تھی۔ لہجہ بھی خاصا مہربان و نرم تھا۔ کبھی کبھی ہی وہ اس انداز میں بات کرنے کا عادی تھا۔ آج وہ جیولر کے پاس جانے کا کہہ رہا تھا شاید اس کی شادی کی ڈیٹ قریب ہی تھی۔ وہ ان ہی سوچوں میں الجھی ہوئی برتن دھونے کے بعد سنک دھو رہی تھی جب وہ وہاں داخل ہوا۔

''میرے خیال میں آج ہم شاپنگ کرلیتے ہیں جیولر کے پاس میں کل چلا جاؤں گا۔'' اس کی استعجابیہ نظروں کے جواب میں وہ گویا ہوا۔

موسم ہلکی خنکی لیے ہوئے تھا۔

بازار میں کھلی دکانوں کے در و دیواروں پر ہلکی دھوپ کھڑی تھی۔ سورج کی کرنوں کی گرمائی اس ٹھنڈے ماحول میں سرور انگیز تھی۔ رائل بلو گرم سوٹ پر رنگین دھاگوں و شیشوں سے دیدہ زیب کام تھا۔ اس کی ہمرنگ چادر اوڑھے وہ سادہ چہرے کے باوجود بہت دلکش و منفرد نظر آرہی تھی۔ باسط کی بے ساختہ نگاہیں کئی بار اس کے چادر کے ہالے میں لپٹے باوقار و پاکیزہ چہرے کا طواف کررہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔

''حسن بے حجاب متاثر کن ہوتا ہے یا حجاب میں رہ کر سحر انگیز؟''

سامان کی خریداری میں باسط نے خاصی مدد کروائی۔ اس دوران کھانے کا وقت ہوا تو وہ اسے ایک ہوٹل میں لے کر چلا آیا۔ انہوں نے وہاں نہ صرف کھانا کھایا بلکہ وہ ڈنر کے لیے بھی کھانا پیک کروا کر لے آیا تھا۔

''وریشا۔ وریشا۔'' وہ ہوٹل سے نکل کر کار کی طرف بڑھ رہی تھی جب اس کے کانوں میں شناسا آواز گونجی۔ وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

''وریشا! تھینک گاڈ یہ تم ہی ہو۔ تمہیں کیا ہوا؟ تمہارا رنگ روپ تم کس کے ساتھ آئی ہو؟'' رمشہ وہیں اس سے لپٹ گئی تھی۔ ساتھ ساتھ بڑی حیرانگی سے اس سے سوالات کرتی چلی گئی۔ بل ادا کرکے آتا ہوا باسط انہیں ملتے دیکھ کر رک گیا تھا۔

''اپنے شوہر کے ساتھ۔'' باسط کی طرف رمشہ کی پشت تھی۔ باسط بہت غور سے وریشا کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر اس لڑکی کو دیکھ کر مسرت و تفکر کے سائے لرزاں تھے۔ آنکھوں میں عجیب سا خوف اتر آیا تھا۔ وہ بھی باسط کو دیکھ چکی تھی اور تعارف کروانا ہی چاہتی تھی کہ وہ بڑے پُرجوش انداز میں گویا ہوئی۔

''مبارک ہو مائی ڈیئر! عاقب بھائی سے تو مجھے ڈبل ٹریٹ لینی ہوگی۔ کہاں ہیں عاقب بھائی؟'' وہ اس کی نگاہوں کے تعاقب میں گھومی تھی۔

''عاقب بھائی۔'' لیکن سامنے کھڑے خوبرو ہینڈسم اجنبی شخص کو دیکھ کر اس کے مسکراتے لب یک دم بھینچ گئے۔ آنکھیں حیرت سے ابل پڑی تھیں۔

''یہ باسط کامران ہیں میرے شوہر۔ یہ رمشہ ہے میری کلاس فیلو اور بیسٹ فرینڈ۔ شادی کے بعد کینیڈا چلی گئی تھی۔'' بہت بردباری و تحمل سے وریشا نے دونوں کا تعارف کرایا تھا۔ رمشہ کا دھواں دھواں چہرہ متغیر ہوتی رنگت اس کے دل پر گزرتی قیامت کی عکاسی تھی۔ خود اس کے اندر بھی بھیانک افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ اول اس طرح سرِراہ رمشہ سے ملاقات دوسرا جس طرح عاقب کا نام لے کر اس کا پکارنا۔ باسط کو دیکھ کر ری ایکٹ کرنا۔ وہ عاقب کے اس دکھ کو بھول گئی تھی جو رمشہ کو دیکھ کر از سرِنو بیدار ہوا تھا مگر

رمشہ کی بدحواسی و بوکھلاہٹ نے جو باسط کی نگاہوں میں شک و اشتعال کے تاثر پیدا کیے تھے وہ اس کی حساس طبیعت سے پوشیدہ نہ رہ سکے تھے۔ وہ بری طرح سہم گئی تھی۔ باسط نے بمشکل اپنی بپھرتی انا کے جنون کو قابو کیا تھا۔ اپنے بدترین خدشوں کا ابھی اسے پکا ثبوت مل گیا تھا۔ یہ احساس ہی اس کے لیے سوہانِ روح تھا کہ وہ معصوم حسن رکھنے والی کلیوں کی طرح پاکیزہ و شفاف نظر آنے والی لڑکی کا کردار اس کی طرح شفاف نہ تھا۔ اس کی زندگی میں اس سے قبل بھی مرد رہا ہے اور یہی احساس اسے چھلنی کرنے لگا۔ تینوں کی اندرونی حالت ایک جیسی ہی تھی۔ تینوں ہی شاکڈ تھے مگر وضع داری و اخلاقیات کا پرچم بلند کیے ہونٹوں پر جبراً مسکراہٹ سجائے رسمی کلمات ادا ہوئے تھے۔ باسط نے اسے گھر مدعو کیا تھا۔

''آپ مجھے انوائٹ نہ بھی کرتے تو میں آجاتی کیونکہ میں صرف کل تک ہوں یہاں پرسوں لاہور چلی جاؤں گی۔'' رمشہ اس سے ایڈریس سمجھنے کے بعد چلی گئی تھی۔ ان دونوں کی واپسی کا سفر بہت کٹھن و دشوار تھا۔ آتے میں جس چہرے کو وہ چوری چوری دیکھتا رہا تھا اب جاتے میں ایک نظر اس پر ڈالنے کا خواہاں نہ تھا' وریشا بھی دم سادھے بیٹھی تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو شام ڈھلنے والی تھی۔ فضا میں کہر بڑھنے لگی تھی۔ باسط کا موڈ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ چوکیدار کو اس نے ہدایت دیدی تھی کہ کوئی بھی آئے اسے باہر سے ہی لوٹا دیا جائے۔ سیل فون بھی آف کر دیا تھا۔ اس وقت اسے منزہ کی صورت دیکھنے' آواز سننے کی بھی ضرورت نہ تھی۔

رات میں اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ بھوک وریشا کو بھی نہ لگی تھی۔ ماحول میں عجیب سی وحشت و پرہول سکوت پھیل گیا تھا۔ باسط وہاں سے آنے کے بعد کمرے میں بند تھا۔ وریشا سے اس نے کوئی بات نہ کی تھی۔ وہ کھانے کا پوچھنے لگی تو بڑے سخت لہجے میں انکار کیا تھا۔ وہ خاموشی سے چلی آئی۔ دل عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ اول روز سے ہی وہ اس کے مزاج دیکھتی آئی تھی۔ اس کے غصے و ناپسندیدگی کی زد میں رہی تھی مگر آج اس کا مزاج و اشتعال سب سے سوا تھا۔

ساری رات گویا کانٹوں پر بسر ہوئی تھی۔ وریشا نے بیڈ پر کروٹیں بدلتے' روتے ہوئے گزاری تو وہ اس برفیلی سردی میں کمبل و جیکٹ سے بے نیاز ٹیرس پر ٹہلتا رہا تھا۔ نہ معلوم کون سی ایسی آگ بھڑک اٹھی تھی جس نے اسے رگوں میں جمانے والی سردی سے بے نیاز رکھا تھا۔ شاید حسد و رقابت کی آگ جلن ہر آگ سے بڑھ کر ہوتی ہے۔

وہ بیڈ روم میں نہیں آیا تھا اور صبح ناشتہ کیے بغیر ہی آفس چلا گیا تھا۔ وریشا اس کی خاموشی سے بری طرح ڈسٹرب ہوئی تھی۔ ذہنی دباؤ و رات بھر جاگنے کے باعث اس کے سر میں درد ہوتا رہا۔ طبیعت پر کسلمندی سی ہو گئی تھی۔ وہ چائے پی کر پکانے کی تیاریوں میں لگی تھی کیونکہ آج رمشہ کو آنا تھا اور اسے یقین تھا وہ یہاں آنے میں زیادہ ٹائم نہیں لے گی کیونکہ اس کی شادی کے بعد اس کے والدین اپنے بیٹے کے پاس جدہ چلے گئے تھے۔ گھر فروخت کر کے پھر رمشہ سے بھی چند ماہ تک رابطہ رہا تھا جو کہ کچھ گوں مصروفیات کی وجہ سے کم ہوتے ہوتے بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ وہ اس کی بہترین دوست تھی۔ ایک ہی محلے میں رہنے کے باعث عاقب سے بھی ملاقات رہتی تھی۔ ان کے درمیان ہونے والی اکثر لڑائیوں میں وہی ثالثی کا رول ادا کرتی تھی۔

وہ ابھی چکن دھو رہی تھی جب وہ ڈرائیور کے ہمراہ آئی تھی۔ ہاتھ میں تازہ پھولوں کا بڑا سا بوکے کیک اور گفٹس پکڑے تھے۔

''تمہارے شوہر کہاں ہیں؟'' رسمی سلام دعا کے بعد وہ استفسار کرنے لگی۔ اس کے انداز میں بے چینی و اضطراب تھا۔ وہ بہت سادہ حلیے میں آئی تھی۔ کل جیسی شوخی و سرت اس کے لہجے سے مفقود تھی۔

''آفس گئے ہیں۔'' وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

''آفس؟ آج سنڈے ہے۔''

''اوہ۔ میرے ذہن سے نکل گیا۔ ویسے وہ گھر میں نہیں ہیں۔''

''وریشا! کل سے اب تک میں نے وقت کانٹوں پر بسر کیا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی تمہیں کبھی عاقب بھائی کے ساتھ نہیں کسی اور کے ساتھ دیکھوں گی۔ کیا ہوا؟ کس وجہ سے تم اور وہ ایک نہ ہو سکے؟ تمہارے درمیان وہ عام روایتی سماج بھی نہ تھا جو ہمارے معاشرے میں عموماً ہوتا ہے۔ دادی' چچا' چچی سب تمہیں بے حد چاہتے تھے اور عاقب کی دیوانگی کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ خود سے بڑھ کر خیال رکھتے تھے تمہارا۔ شاید ہی کسی نے کسی سے اتنی محبت کی ہو جتنی وہ تم سے کرتے تھے پھر ایسا کیا ہوا؟ کس سنگ دل نے تم دونوں کو جدا کر دیا؟'' وہ ایک سانس میں بولتی گئی۔

''موت نے۔'' اسے اپنی آواز خود کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

''وہاٹ ...... یہ ...... یہ ...... تم کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ صدمے و بے یقینی کی انتہا پر تھی۔ وریشا کی آنکھوں سے بے آواز آنسو گرنے لگے۔

''عاقب ...... بھائی ...... کی ڈیتھ ...... مگر کس طرح؟ کافی دیر بعد وہ اس شاک سے سنبھلی تو شدتوں سے رو پڑی تھی۔ وریشا خود کو سنبھال چکی تھی۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا' یہ سب کیسے ہوا؟'' رمشہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''احمر بھائی کی شادی والے دن۔ بارات کے جاتے وقت وہ ان کی کار کی چابی لینے ان کے کمرے میں گیا تھا۔ چابی نیچے اچھال کر وہ ہٹ ہی رہا تھا کہ احمر بھائی کے دوست جو ان کی شادی کی خوشی میں فائرنگ کر رہے تھے۔ ان کے ریوالور سے نکلی کسی گولی کا وہ شکار ہو گیا تھا۔'' پرانے زخموں کے ٹانکے پھر سے کھل گئے تھے۔ ہر زخم' ہر تکلیف تازہ ہو گئی تھی۔ اس کے قریب بیٹھی رمشہ رو رہی تھی۔ عاقب کو یاد کر رہی تھی۔

وہ اس کے حق سے محروم کر دی گئی تھی۔ عاقب جو کبھی سب کچھ تھا۔ اب کچھ نہ رہا تھا۔ اس کی سانس کے ساتھ سب کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ کبھی نہ جڑنے کے لیے۔ عاقب کی یاد کو اس نے اپنے دل سے کھرچ کر پھینکنے کی سعی کی تھی کیونکہ وہ اب کمسن لڑکی نہ رہی تھی۔ ایک عزت دار گھرانے کی بہو' ایک باعزت و باوفا شخص کی بیوی تھی اور بیوی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے مجازی خدا کے گھر میں بیٹھ کر اپنے سابقہ منگیتر کی یاد میں آنسو بہائے۔ آنسوؤں پر اختیار کب رہتا ہے؟ یادوں پر پہرے کون بٹھا سکتا ہے مگر عورت کی حرمت و وفا کا پاس یہی تھا کہ دل پر پتھر رکھ لیا کرتی تھی۔ آنکھوں کو نم ہونے نہ دیتی۔ خواہ دل میں رم جھم ہوتی رہے۔ اس وقت بھی وہ خود سے نبرد آزما تھی۔

''عاقب کے بعد چچا' دادی اور چچی بھی دنیا چھوڑ گئے۔ ایک سال کے اندر چچا کی فیملی خاک تلے جا سوئی۔ سب ختم ہو گیا۔'' اس نے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔ رمشہ نے اسے سینے سے لگا لیا۔

''تمہارا حوصلہ' تمہارا صبر' تمہاری برداشت دیکھ کر میں دنگ رہ گئی ہوں وریشا! تم بالکل بدل گئی ہو۔ اتنی سنجیدگی تمہارے اندر آ گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے ہنسنا تو کیا تم مسکرانا بھی بھول چکی ہو۔ دادی جان کو کتنی چڑ تھی نا تمہارے ہنسنے سے۔ اگر آج وہ ہم میں ہوتیں تو کہتیں وریشا تم ہنسا کرو تم ہنستی اچھی لگتی ہو۔'' رمشہ پر ہنوز رقت طاری تھی۔

''میرا دل مردہ ہو گیا ہے۔ دادی جان ٹھیک کہتی تھیں۔ زیادہ ہنسنے سے چہرہ بے رونق ہو جاتا ہے۔ پھٹکار برسنے لگتی ہے جو بہت ہنستا ہے۔ وہ بہت روتا بھی ہے۔'' خاصی دیر وہ عہد رفتہ کو یاد کرتی رہی تھی۔ اس دوران رمشہ نے صرف کافی پی تھی۔ ایسے اندوہناک حقائق نے اس کی بھوک پیاس اڑا کر رکھ دی تھی۔ وریشا کی ہر ممکن کوشش کے باوجود اس نے اسے دعوت کا کوئی اہتمام نہ کرنے دیا تھا۔ وہ باتوں سے سیر ہونا چاہتی تھی۔

''وریشا! باسط بھائی کیسے ہیں؟ شخصیت ان کی گڈ لکنگ ہے مگر تمہارے ساتھ ان کا رویہ کیسا ہے؟ کیا وہ یہ سب جانتے ہیں؟ تم خوش ہو؟'' حسبِ عادت اس نے کئی سوال پے در پے کر ڈالے تھے۔

''بہت کیئرنگ ہیں۔ بہت محبت کرتے ہیں۔ عاقب کے بارے میں' میں نے ان کو نہیں بتایا۔ تم بتاؤ کیا بتانا چاہیے؟'' وہ کل رات سے باسط کا رویہ دیکھ کر دل میں ابھرنے والے سوال کی بابت پوچھ بیٹھی۔

''نہیں ہرگز نہیں ...... بھول کر بھی یہ بے وقوفی مت کرنا۔ مرد خود کہیں بھی گل کھلاتے پھریں۔ شادی کے بعد بھی دوسری عورتوں کے چکروں میں رہیں۔ دوسری' تیسری شادیاں کریں۔ یہ سب اپنے لیے جائز و حلال سمجھتے ہیں مگر خود سے وابستہ ہونے والی عورت کو اتنا پاک و صاف سمجھیں گے کہ اس کے خوابوں میں بھی کسی مرد کا تصور نہ آیا ہو' یہ دوغلی ذہنیت کے ہوتے ہیں۔ تمہارا اور عاقب بھائی کا رشتہ کتنا پاکیزہ و مقدس تھا۔ تم جانتی ہو یا ہم' اگر انہیں بتاؤ گی تو اچھا نہ ہو گا۔'' رمشہ لنچ کے لیے نہیں ٹھہری تھی۔ اس کو لاہور جانا تھا۔ وہاں چند دن رک کر کراچی جہاں سے اس کی واپسی کینیڈا تھی۔ بڑی اداس و ہول سی وہ واپس گئی تھی۔

❁......❁......❁

صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی۔ باسط گھر نہیں آیا تھا۔ اس کی فکر سے حالت غیر ہونے لگی۔ وہ اس طرح کبھی نہیں گیا تھا۔ اگر جاتا بھی تھا تو گھر پر کچھ وقت گزار کر جاتا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی جا رہی تھیں۔ وسوسے اس کے ذہن کا گھیراؤ کر کے چین و قرار لوٹ رہے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کس سے اس کا معلوم کرے۔ وہ کسی سے بھی واقف نہیں تھی۔ اس نے یہ اختیار بھی کب دیا تھا۔

رات کے تاریک سائے دھرتی پر پوری طرح سایہ فگن ہو گئے۔ وہ نہیں آیا۔ وہ دل پکڑ کر بیٹھتی چلی گئی۔ باسط کی جفائیں' بے اعتنائی و بے رخی سب پس پشت چلی گئیں۔ اب اسے یاد تھا تو صرف یہ کہ وہ اس کا مجازی خدا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر سکھ ہر دکھ اس کی ذات سے وابستہ ہے۔ اسے اپنی تڑپ و بے چینی پر حیرت تھی۔

وہ اس شخص کے لیے آنسو بہا رہی تھی۔ اس شخص کے لیے فکرمند تھی جس نے پہلی شب ہی اس کی آرزوؤں و خواہشوں کو بے رحمی سے اپنے قدموں تلے روند ڈالا تھا اور بہت سفاکی سے اس کی ذات کو ناپسندیدہ قرار دیا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ من مانی کرتا رہا تھا۔ اس کی موجودگی پر وہ کیے بنا منزہ سے آزادانہ میل جول' سیل پر رومانس بھری ہر شب رومانس بھری گفتگو کرتا۔ وقتی طور پر اسے بدظن کر دیا تھا مگر ان لمحوں میں اس پر انکشاف ہوا تھا کہ نکاح کے مقدس تین لفظوں میں کیسی طاقت و قوت ہوتی ہے جو عورت کو پرانے تعلق بھلا کر اس تعلق کا ہمیشہ کے لیے اسیر کر دیتی ہے۔ دل کے فریم سے عاقب کی تصویر نہ معلوم کب محو ہوئی تھی۔ اب وہاں باسط کی حکمرانی تھی۔ اس کا جیتا جاگتا تصور براجمان تھا۔ دل کے اس اختیار پر وہ ششدر تھی۔

عشا کی نماز سے فارغ ہو کر وہ سربسجود کتنی ہی دیر تک باسط کی خیریت سے آنے کی دعائیں مانگتی رہی تھی پھر چوکیدار کے اس انکشاف نے اسے سرتاپا لرزا کر رکھ دیا تھا کہ وہ شام میں گاڑی لے کر گیا ہے۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ وہ بیرونی دروازے سے داخل ہو کر لاؤنج سے ملحقہ کمرے میں بیٹھ گیا اور ان دونوں کی گفتگو سنتا رہا تھا۔ اس کی غیر موجودگی کے خیال سے انہوں نے کوئی احتیاط بھی نہ برتی تھی۔ وہ سب سنتا رہا تھا۔ ساری حقیقت اس کے آگے عیاں ہو چکی تھی۔ کل رمشہ کے منہ سے عاقب کا نام سن کر

ساری رات اس نے جس ٹینشن میں گزاری تھی اور صبح کھائے پیے بنا گھر سے نکل گیا تھا۔ سب سن کر اس کا کیا حال ہوا ہوگا؟ وہ متوحش سی ٹہل رہی تھی۔ کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی اس کے آنسوؤں کی روانی کم نہ ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں رمشہ کی آواز گونج رہی تھی۔

''مرد خود خواہ کتنی ہی غلاظت میں لتھڑے ہوں مگر اپنی شریک حیات کے متعلق معمولی سی بھی بات برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کا ظرف بہت کمتر ہوتا ہے۔'' باسط کے کل سے اب تک کے سرد و خاموش رویے نے رمشہ کی بات کی تصدیق کی تھی۔ رات گئے وہ لوٹا تھا۔

''کہاں چلے گئے تھے آپ؟'' باسط دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ جو اندیشوں و وسوسوں میں ادھ مری ہو چکی تھی۔ اسے سامنے دیکھ کر بے اختیار اس کے بازو سے لپٹ کر رو پڑی تھی۔

''افسوس ہو رہا ہے میرے زندہ واپس آنے پر......'' وہ اس کی گرفت سے بازو چھڑا کر ترش روی سے گویا ہوا تھا۔ وہ ششدر رہ گئی۔

''یہ......آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' اس کی آواز کانپتی ہوئی تھی۔

''آج کچھ پکایا بھی ہے یا سوگ منا رہی ہو؟'' بکھرے بال، شکن آلود لباس، سرخ بے خوابی ظاہر کرتی مشتعل آنکھیں، زبان سے شعلے برساتا وہ شخص آتش فشاں بنا ہوا تھا۔

''کس کا سوگ؟ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' وہ کانپتی آواز میں بولی۔ جواباً اس کے چہرے سے چنگاریاں سی نکلنے لگی تھیں۔ وہ بھسم کر دینے والی نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے لفظ لفظ چبا کر کہہ رہا تھا۔

''میری سماعتیں بے اثر نہیں ہیں میری بصارت کام کرتی ہے۔ میں تمہارے کل سے آگاہ ہو چکا ہوں۔'' وہ کچھ توقف کے لیے خاموش ہوا تھا۔

''تم نے مجھ سے فراڈ کیا...... چھپایا اپنا ماضی اور اپنا داغ دار کردار لیے مجھ سے ناتا جوڑ لیا۔'' زبان گویا دو دھاری تلوار بن گئی تھی۔

''باسط صاحب پلیز! آپ نے سب سن لیا ہے تو یہ بھی سن لیا ہوگا کہ آپ جو سوچ رہے ہیں وہ بالکل غلط ہے عاقب......''

''بہت سن چکا ہوں تمہارے منہ سے تمہارے عاشق کا نام۔ دن تو تم اس کی یادوں میں بسر کرتی ہو۔ راتوں کو خوابوں میں بھی اسے پکارتی ہو۔ مجھ سے بڑا بے غیرت کوئی نہ ہوگا جو تم جیسی عورت کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوں جو ساتھ میرے ہے مگر یادوں میں دوسروں کی رہتی ہے۔'' وہ اس وقت شقی القلب و تنگ نظری کی پستی میں گرا ہوا سنگ دل لگ رہا تھا۔ شدید اشتعال میں وہ محسوس بھی نہ کر سکا کہ کتنی نازیبا زبان استعمال کر رہا ہے۔

''آپ نے صرف اپنے مطلب کی بات سنی اور چلے گئے اور اب اپنی پست ترین ذہنیت کی عکاسی کر کے میرے صاف و شفاف ماضی کو گرد آلود کر رہے ہیں۔'' عورت ہر دکھ ہر ستم ہر تکلیف برداشت کر سکتی ہے مگر اپنی پاکبازی و عصمت کی اجلی چادر پر رسوائی یا شک کی معمولی سی گرد بھی اسے شیر بنا دیتی ہے۔ وریشا بھی اس کی بہتان آمیز گفتگو برداشت نہ کر سکی تھی۔

''بکواس بند کرو۔ میں خواہ مخواہ خود کو تکلیف دیتا رہا۔ شادی کی پہلی شب جو تمہارے ساتھ برتاؤ کیا۔ ہر وقت تمہاری توہین و تذلیل کی اور پھر یہاں لا کر رہنے پر کچھ عرصے بعد ہی میرے ضمیر نے مجھے جھنجھوڑنا شروع کیا کہ اس صابر و تابعدار سی لڑکی کو کیوں تم گھر والوں کی زیادتی کی سزا دے رہے ہو؟ تمہاری خاموش خدمت گزاری کسی بھی لالچ کے بغیر میرا خیال رکھنا، ہر کام بنا کہے کرنا اور اس پر مستزاد گھر والوں کی ہر روز کی تعریفیں سچی محبت کے مظاہروں نے غیر محسوس طریقے سے مجھے تمہارے متعلق سوچنے پر راغب کر دیا تھا۔ میں جو شروع شروع میں تم سے بھاگتا تھا۔ تمہاری صورت سے چڑتی مجھے پھر میں محسوس کرنے لگا۔ آفس میں مجھے ٹائم گزارنا دشوار لگنے لگا ہے۔ میرے اندر جلد سے جلد گھر بھاگنے کی خواہش رہنے لگی تھی اور گھر آ کر میرا باہر جانے کو دل نہیں کرتا تھا۔ چوری چوری میں تمہارا مشاہدہ کرنے لگا کہ جو تبدیلی میرے اندر سرایت کر چکی ہے اس نے تمہیں بھی متاثر کیا ہے یا نہیں......''

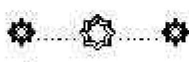
چھ ماہ کی بھڑاس آج اس کے سلگتے لہجے سے عیاں تھی۔

''مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ تمہارا انداز وہی تھا کسی روبوٹ کی طرح جذبات و احساسات سے عاری وجود۔ سپاٹ چہرہ و بے جان تم کسی مشین کی طرح اپنے فرائض کی تکمیل میں سرگرداں رہتی ہو۔ پہلے میں نے خیال کیا شاید میرے برے رویے نے تمہارا دل توڑ دیا ہے۔ تم مجھ سے بدظن ہو گئی ہو اور میں اپنے رویے کی تلافی کرنا ہی چاہتا تھا کہ اتفاقاً میں نے تمہاری امی سے ہونے والی تمہاری گفتگو سن لی جس میں تم نے ان سے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا تھا کہ تم ان کے لیے مر چکی ہو۔ آئندہ وہ تم سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔''

وہ ایک کے بعد ایک انکشاف کر رہا تھا۔

''اس وقت میرے دل میں تمہاری جانب سے بدگمانی نے جنم لیا تھا کیونکہ کچھ ایسے فقرے میں نے اسی طرح جذباتی انداز میں بی جے کہے تھے جب انہوں نے منزہ سے شادی کی خواہش پر میرا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ تمہاری لاتعلقی و بے نیازی کا ایک سرا ملا تو رفتہ رفتہ ساری گرہیں کھلنے لگیں۔ یکے بعد دیگرے بہت مواقع مجھے ملے۔ تمہیں سمجھنے کے منزہ کی آمد، میری اس سے شادی کا پلان راتوں کو اس کی کالز تم سب پتھر کی مورت کی طرح دیکھتی رہیں، سنتی رہیں۔ میں منتظر رہا کہ تم مجھے منزہ سے ملنے سے روکو۔ اس کی کالز آئیں تو سیل اٹھا کر پھینک دو۔ مجھے شادی نہ کرنے دو...... مگر تم نے میری ہر سوچ کی نفی کی، گھر والوں کو بھی جھوٹی تسلیاں دیتی رہیں۔ یہاں مجھے پوری آزادی منزہ سے ملنے کی دی۔ سنا تھا عورت مرد کے مقابلے میں معمولی سی بھی شراکت برداشت نہیں کر سکتی۔ منہ کا لقمہ تقسیم کر سکتی ہے شوہر نہیں...... تم نے گھر والوں کے دباؤ میں آ کر مجھ سے شادی تو کر لی مگر مجھے مجازی خدا کا رتبہ و مقام نہ دے سکیں۔ کچھ دن قبل تمہیں خواب میں عاقب، عاقب پکارتے دیکھ کر میرے شک کو آدھا یقین ملا تھا۔ کل سے آج تک اس پر یقین و صداقت کی پکی مہر لگ گئی ہے۔ مرد ایسی بے وفائی پر...... ایک طوائف کو تو معاف کر سکتا ہے مگر ایک ایسی لڑکی کو نہیں جو اعلیٰ و معتبر خاندان کا لیبل سجا کر کسی کی بیوی بنی ہو۔ یہ ٹکٹ ہے صبح ڈرائیور تمہیں ایئر پورٹ چھوڑ آئے گا۔ کراچی جا کر اپنے منہ سے بی جی کو اپنے ماضی کی داستان سنانا۔ بہت ناز ہے انہیں اپنی عزت دار خاندانی بہو پر۔ صبح میرے اٹھنے سے قبل یہاں سے چلی جانا ورنہ......''

وہ سارا زہر اگل کر ٹکٹ اور کئی نوٹوں کی گڈیاں اس کی طرف اچھال کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔ اس کی جانب دیکھے بنا جو اتنے بڑے الزام اتنی بڑی گالی کو سن کر وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی۔



سلیپنگ پلز کھا کر وہ دن چڑھے تک سوتا رہا تھا۔ اٹھا تو دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ اٹھتے ہی بیڈ ٹی کی طلب بیدار ہوئی تھی۔ بے ساختہ نگاہ سائیڈ ٹیبل پر گئی جہاں ہر صبح بھاپ اڑاتا کپ اس کے لیے موجود ہوتا تھا۔ وہ بنا کہے اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی اور اسی سبب اس کا دل نرم کر چکی تھی۔ اس کا تصور آتے ہی اس کے ہونٹ نفرت آمیز انداز میں سکڑ گئے تھے۔ وہ اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ وہاں جا کر اسے پھر جھٹکا لگا تھا۔ ہینگر اس کے استری شدہ سوٹ سے خالی تھا۔ وہ جھنجلاتا ہوا باہر آیا تھا۔ وارڈ روب سے سوٹ نکالنے میں اس کو از حد دشواری ہوئی تھی۔ حالاں کہ تمام سوٹس استری شدہ ہینگ ہوئے تھے مگر اسے عادت کہاں رہی تھی۔ وریشا از خود یہ کام کرتی تھی۔ باتھ لے کر آیا تو ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہر شے اسے خود سے دور محسوس ہو رہی تھی۔ ایک البیلی خوشبو بکھیرتا خاموش وجود اس کی نگاہوں میں متحرک رہا تھا۔ وہ ہر صبح اس کی تیاریوں میں اس طرح مدد کرتی تھی۔ وہ اس کے بریف کیس میں فائلز اور دیگر چیزیں رکھتی تھی۔ روز لاپرواہی سے وہ اپنا سامان ادھر ادھر رکھ دیا کرتا تھا۔ وہ یاد سے اس کے لباس کی جیبوں سے منتقل کرتی تھی۔ ٹیبل پر اشتہا انگیز خوشبوؤں سے مہکتا ناشتہ اسے اپنی جانب راغب کر لیا کرتا تھا۔

وہ خوبیوں کا مرقع تھی۔ ہر کام بڑی پھرتی و سلیقہ مندی سے کرتی تھی۔ اس کے ہاتھوں کے پکے کھانوں میں اتنی لذت ہوتی تھی کہ وہ چائے بھی باہر پینا پسند نہیں کرتا تھا۔

آج گویا سب ختم ہو گیا تھا۔

وہ تیار ہو کر آیا تو گھر میں سناٹے بین کر رہے تھے۔ ویرانی در و دیوار سے لپٹ لپٹ کر نوحہ کناں تھی۔ کل تک جو خاموش وجود کے دم سے یہاں بہاروں کے پیراہن لہلہاتے تھے۔ اب وہاں خزاں اپنا خاک آلود سراپا ڈالے بیٹھی تھی۔

وہ دل کی صداؤں کو قدموں تلے کچل کر لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔ اندر ٹیبل پر اس کے نوٹوں کی گڈیاں یوں ہی پڑی تھیں۔ البتہ ٹکٹ غائب تھا۔

''گیٹ لاسٹ۔'' وہ تصور میں چھائے اس کے سراپے سے مخاطب ہوا۔ گیٹ لاک کر کے باہر آیا تو چوکیدار نے بتایا۔ بیگم صاحبہ صبح ایئر پورٹ چلی گئی تھیں۔ اس کا ذہن بے شمار انتشار و اضطراب کا شکار تھا۔ اندر اتنی وحشت و بے سکونی پھیلی ہوئی تھی کہ رگ رگ اسے چٹختی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ دل میں اتنا اشتعال و جنون تھا کہ پوری دنیا کو آگ لگانے کو دل چاہ رہا تھا۔ کتنا وقت سڑکوں پر سرگشت کرتے ہوئے گزر ا تھا۔ دل کو چین و قرار کسی طور نہ ملا تو وہ منزہ کی طرف آ گیا جو اسے دیکھ کر پھولوں کی طرح کھل اٹھی۔

''مل گئی فرصت؟ نہ کال ریسیو کرتے ہو نہ گھر پر ملتے ہو۔ واچ مین باہر سے ہی کہہ دیتا ہے۔ صاحب گھر پر نہیں ہیں......کہاں ہو تم؟'' بڑے ناز سے اٹھلا کر وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ سیاہ ویلوٹ کا چست لباس، امپورٹڈ خوشبوؤں سے مہکتا وجود اور خوب صورت چہرے پر تازہ میک اپ کی سرخیاں۔ انداز میں بلا کی وارفتگی و والہانہ پن اس کا ہر انداز دلربائی و رعنائی سے بھرپور تھا۔

''پلیز چائے پلواؤ۔ اپنے ہاتھوں کی بنی ہوئی۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔'' باسط آنٹی کو سلام کر کے اس سے مخاطب ہوا۔ اس کے شکوے از خود نظر انداز کیے تھے اس نے۔

''چائے......اور میں بناؤں اپنے ہاتھوں سے؟'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

''میں نے تمہیں کوئی جوک نہیں سنایا۔ چائے کی فرمائش کی ہے۔'' آگ اس کے اندر پہلے ہی بھڑک رہی تھی۔ قریب بیٹھی منزہ کی ہنسی اور آنٹی کی مسکراہٹ نے اس کو اور تپا ڈالا۔ وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''باسط بیٹا! مائنڈ مت کرنا۔ منزہ نے ایک برتن کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کچن میں کیسے کام کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں جانتی۔ تم اس سے چائے بنانے کا کہہ رہے ہو۔''

''چلو باہر چلتے ہیں کسی فنٹاسٹک سے ہوٹل میں چائے پئیں گے۔'' منزہ نے اپنا مرمریں بازو اس کے شانے پر رکھتے ہوئے لاڈ سے کہا۔

''واپسی میں کھانا پیک کروا کر لے آنا۔ حرام خور ملازمہ نے آج چھٹی کر لی ہے۔ انڈہ ڈبل روٹی کھا کر میری بھوک نہیں مٹی۔ باسط بیٹے! کاجو اور پستے سے بنا وہ اصلی گھی والا حلوہ ضرور لے کر آنا۔ پچھلی دفعہ منزہ نے مجھے چکھایا بھی نہیں تھا۔''

''توبہ توبہ مما! کس قدر جھوٹی عورت ہیں آپ۔ کھا کر مکرتی ہیں۔'' منزہ کے انداز پر باسط چپ نہ رہ سکا تھا۔

"یہ کس طرح بات کر رہی ہو تم آنٹی سے؟ ماں ہیں تمہاری بزرگ ہیں۔"

"تم نہیں جانتے ڈیئر! میں جانتی ہوں ان کی بزرگی۔" اس کے انداز میں طنز تھا۔

"اوکے آنٹی! میں کل آپ کو حلوہ لا دوں گا۔ اس وقت شاپ بند ہوتی ہے۔

"سر درد کی وجہ سے مجھ سے ڈرائیونگ نہ ہو سکے گی۔ منزہ آج تم میری خاطر چائے بناؤ اور نہ صرف چائے بلکہ مکمل کوکنگ سیکھو۔ میں ہر روز بازار کے کھانوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہیں میری خاطر سب کرنا ہوگا۔"

"ارے تم مجھے بیوی بنا کر لے جانا چاہتے ہو یا باورچن؟ کم از کم مجھ سے ایسی امید مت رکھنا۔ مجھے گھر کے کاموں سے الرجی ہے۔ دم گھٹتا ہے میرا۔" منزہ وریشا کو دیکھ چکی تھی کہ اس نے کتنی نفاست و سلیقہ مندی سے پورا گھر سنبھالا ہوا ہے مگر اس کا خیال نہ تھا کہ باسط اس سے بھی ایسی توقع رکھ سکتا ہے اور اب اس کے خیالات نے دونوں ماں بیٹی کو چونکا دیا تھا۔

"بیٹا! تم بھی کیسی دقیانوسی باتیں کر رہے ہو۔ اس دور میں تو غریب غربا بھی دو تین ملازم افورڈ کر لیتے ہیں اور تم تو اے گریڈ کے آفیسر ہو۔ تمہیں نوکروں اور دولت کی کیا کمی..... ایک اشارے پر ملازمین کی لائن لگ جائے گی۔"

جواباً باسط کے بگڑتے تیور دیکھ کر وہ کھسیا کر اٹھتے ہوئے بولیں۔

"آرام سے بیٹھو۔ میں بنا کر لاتی ہوں چائے۔"

"میں جا رہا ہوں رہنے دیں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں بیٹا! ایسا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے پہلی بار کوئی فرمائش کی ہے تم نے اور ایسے ہی جاؤ گے۔ تم بیٹھو فٹافٹ بنا کر لاتی ہوں۔" اس کے اکھڑے اکھڑے رویے سے خطرہ سا محسوس ہوا تو وہ منزہ کو اشارے سے سمجھا گئیں۔

"تم یہاں لیٹو ڈارلنگ! میں سر دباتی ہوں۔ دیکھنا کیسا سکون ملتا ہے۔" اس نے بازو پکڑ کر اسے آغوش میں گرانا چاہا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔

"اوہ گاڈ! تم تو ایسے دور بھاگتے ہو جیسے میں کوئی بلا ہوں۔ ہم میاں بیوی ہیں پھر تمہارا یوں دور دور رہنا مجھے سمجھ نہیں آتا ہے۔"

"ہم میاں بیوی ہیں نہیں..... ہونے والے ہیں یاد رکھا کرو۔"

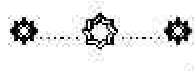
"یہ سوشل ایکٹویٹیز صرف دکھاوے کی ہوتی ہیں ورنہ تم مجھے چاہتے ہو میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔ ہمارے دل ایک ہیں، ہمیں ہر طرح کا اختیار حاصل ہے۔" وہ شانے اچکا کر ٹھوس لہجے میں گویا ہوئی۔

"مجھے تم کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے یا تم مجھے سمجھ نہیں سکی ہو۔"

"اوہ..... کم آن ڈیئر! نہ معلوم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ چلو باہر چلتے ہیں۔ گھر بیٹھے بیٹھے بور ہو گئی ہوں۔" اسے سیریس دیکھ کر منزہ نے بات بدلی۔

"تم کہتی ہو تمہیں مجھ سے محبت ہے تو یہ کیسی محبت ہے جو تم میری صورت دیکھ کر میرے خاکستر ہوتے دل کا اندازہ نہیں لگا سکی ہو۔ مجھ پر جان دینے کی قسمیں کھانے والی۔ ایک کپ چائے بنانے کی قربانی نہیں دے سکتی؟ جو محبت کرتے ہیں وہ چہرہ دیکھ کر دل کا بھید پا لیتے ہیں، بنا کہے درد غم سمجھ جاتے ہیں..... تمہاری یہ کیسی محبت ہے؟ کیسی انجانی چاہت ہے جو مجھے شناخت نہیں کر پا رہی۔ میں کرب کی دھوپ میں تپتا ہوا تمہاری پیار کی چھاؤں کی آس میں آیا تھا اور تم مجھے بنا سمجھے اپنی کہے جا رہی ہو۔" پہلی بار اس کے دل میں منزہ کی جانب سے تنفر جاگا تھا مگر صرف سوچ کر رہ گیا تھا۔

آنٹی چائے لے آئی تھی۔ ساسر اور کپ چائے کی پتی اور چائے سے بدنما تھے۔ کپ کے کناروں پر پتی چپکی ہوئی تھی اور کچھ جھڑ کر ساسر میں چپکی ہوئی چائے پر تیر رہی تھی۔ اس پر مستزاد کم پتی و کم دودھ والی بے رنگ چائے دیکھ کر ایک گھونٹ پیے بغیر ہی واپس چلا آیا تھا۔



وقت جو کبھی اتنی سرعت و پھرتی سے گزرتا تھا کہ اسے اس کے گزرنے کا گلہ رہتا تھا۔ ان آٹھ دنوں میں چیونٹی کو بھی مات دے چکا تھا۔ وہ آفس سے چھٹیاں لے چکا تھا۔ عجیب بیزاری و پژمردگی اس کی ذات کا گھیراؤ کر چکی تھی۔ وہ اپنی اندرونی کیفیت پر قابو نہیں پا رہا تھا جو اسے ان راستوں پر گامزن کر رہا تھا جن کو وہ دھتکار چکا تھا، ٹھوکر مار چکا تھا۔ پہلی نظر میں وہ جس کو ناپسندیدہ قرار دے چکا تھا۔ دل کے نہ معلوم کون سے خفیہ تہہ خانے میں وہ اسی لمحے چھپ گئی تھی۔ وہ اس کو محسوس نہ کر سکا تھا جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ تناور درخت بن گیا تھا۔ شدید طیش و اشتعال میں وہ اس جذبے کو کچلنے میں مصروف تھا اور مسلسل ناکامی کا شکار بھی۔ وریشا کی موجودگی میں کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کے وجود کا اتنا عادی ہو گیا ہے کہ اس سے دور رہنے کی خواہش کے باوجود وہ خود کو تنہا اور نامکمل محسوس کر رہا تھا۔ وریشا کو گئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ ان چند دنوں میں اس پر بے شمار احساسات و حقائق منکشف ہوئے تھے۔ اسے خود احتسابی کا موقع ملا ضمیر نے نہایت فرض شناسی و دیانت داری سے اس کے طرز عمل اور وریشا کی ثابت قدمی و صبر و استقامت کا موازنہ کر ڈالا تھا جب اسے ضمیر کے آئینے میں صورت دیکھنی پڑی تو وہ ششدر رہ گیا۔ منافقت و ریاکاری سے اس کا باطن سیاہ ہو رہا تھا۔ ذات کا ہر مخفی پہلو کردار کا ہر جھول اسے نظر آ رہا تھا۔ ضمیر کی عدالت لگ چکی تھی۔ وہ کٹہرے میں سر جھکائے کھڑا گزرے وقت کے منظروں میں گم تھا۔

وریشا اور اس کی شادی کو چھ ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دوران کوئی دن ہی ایسا گزرا ہوگا جب اس نے اسے اپنی ناپسندیدگی کا احساس نہ دلایا ہو نہ جتایا ہو کہ وہ اس کی پسند نہیں ہے۔ زبردستی بے جی کی خاطر وہ اسے برداشت کر رہا ہے۔ عورت کی انا کتنی لاغر ہوتی ہے۔ یہ وہ بخوبی جانتا تھا۔ جان بوجھ کر وہ اس کی انا کو گھائل کرتا رہا تھا۔ عزت نفس کے پندار پر ضربیں لگاتا رہا تھا اس لیے کہ وہ اس کے ٹھنڈے انتقام سے گھبرا کر چلی جائے، چھوڑ جائے اسے کبھی واپس نہ آنے کے لیے اور وہ سرخرو ہو جائے...... اب وہ چلی گئی تھی تو اس کا دل بالکل کہیں نہیں لگ رہا تھا۔ اپنی ساری بے حسی و بے نیازی یاد آ رہی تھی اور وہ ضمیر کے شکنجے میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

"تم جو خود کو اتنے بری سمجھتے ہو آزاد و خود مختار زندگی گزارنے کے عادی ہو۔ اپنی من مانی کرنا تمہاری سرشت میں شامل ہے۔ کل منزہ تمہاری منزل تھی جس کی خاطر تم نے اس لڑکی کی قدم قدم پر اسلٹ کی جس کو تم اپنا نام دے کر لائے تھے۔ آج منزہ کے تصور سے بھی تم الرجک ہو اور تمہارا من اس لڑکی کی یادوں میں گم ہے جس کی کل تک تمہاری نظروں میں کوئی وقعت نہ تھی۔" وحشتوں و جنوں خیزیوں کے بادل جب چھٹے تو اسے حواسوں پر پڑا پردہ بھی اٹھتا ہوا محسوس ہوا اور وہ نہایت غیر جانب داری سے اپنا تجزیہ کرنے لگا۔

"تم جو ہر لمحہ وریشا کو یہ احساس دلاتے رہتے تھے کہ وہ تمہاری محبت نہیں ہے۔ تم ایک دن بھی یہ انکشاف برداشت نہ کر سکے کہ وہ..... بھی کسی سے محبت کرتی ہے، کوئی اس کی زندگی میں بھی اتنا اہم رہا ہے۔ اس حقیقت نے تمہیں کتنی تکلیف دی، تمہاری بھوک و پیاس، نیند و آرام سب ہوا ہو گیا اور تم جو لوگوں میں بہت مہذب و نرم مزاج سمجھے جاتے ہو اچانک ہی اتنے اجڈ، کم ظرف، کینہ پرور ظالم بن گئے کہ جو زبان پہ آیا بنا سوچے سمجھے کہتے چلے گئے۔ ذرا بھی تمہیں احساس نہ ہوا کہ اس لڑکی کے دل پر کیا گزرے گی جو بہت تحمل و بردباری سے وہ سب برداشت کرتی رہی جو کوئی دوسری لڑکی ہرگز برداشت نہ کرتی۔ تم مرد ہو کر کم ظرف و کم حوصلہ نکلے، وہ لڑکی ہو کر تم سے بلند ظرف و بلند حوصلہ نکلی۔ بے جی ٹھیک کہتی ہیں وقت پر کھرے کھوٹے کی پہچان اناڑی کو بھی ہو جاتی ہے، میں بھی ایسا ہی اناڑی تھا، وقت پڑنے سے قبل سمجھا نہیں تھا۔

وریشا کی جدائی نے آنکھوں سے تمام حجاب اٹھا دیے ہیں تو منزہ کی قربت نے دل کی چاہت کو سمجھنے میں آسانی فراہم کر دی ہے۔ ان نو دس دنوں میں گھر کی تنہائی و دل کی وحشت سے گھبرا کر وہ بار بار منزہ کی طرف بھاگا تھا اور ممکن تھا کہ وہ اس وحشت و جنوں سے گھبرا کر منزہ سے شادی کر بیٹھتا۔ جس کو نہ معلوم جذبے کے تحت ملتوی کرتا آ رہا تھا کہ منزہ اور اس کی ماں کی حرکات و سکنات پوری طرح اس کی نگاہوں میں آ گئی تھیں۔ منزہ سے اس کا افیئر بہت پرانا تھا لیکن گھر والوں خصوصاً بے جی کو یہ فیملی قطعی پسند نہ تھی۔ وہ کہتی تھیں۔ منزہ کی ماں کے چال چلن شروع سے اچھے نہیں ہیں کیونکہ وہ شریف گھرانے سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ کسی ناچنے والی کی بیٹی ہے۔ جس نے اپنے شوہر کو دوسرے آدمی کے چکر میں زہر دے کر مار دیا تھا اور اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے بچ گئی تھی۔ خاندانی نام و نمود کو جان سے بڑھ کر اہمیت دینے والی بے جی کسی ایسی ماں کی بیٹی کو بہو بنانے کے تصور سے بھی نا آشنا تھیں اور وہ ان دنوں اس کی محبت کی شدت میں اس حد تک مبتلا تھا کہ خاموشی سے کورٹ میرج کرنے پر رضامند ہو گیا تھا پھر نہ معلوم اس کی تقدیر کا فریب تھا یا بے جی و ماں کی دعاؤں کا اثر۔ اس ہفتے وہ فرم کی جانب سے بنکاک چلا گیا تھا جہاں سے واپسی میں خبر ملی کہ منزہ شادی کر کے ماریشس میں جا بسی ہے۔ اس خبر سے جہاں اس کے دل کی دنیا تباہ و برباد ہوئی۔ وہاں گھر والوں کے خلاف دل میں بدگمانی و بے رخی کی فصل بھی اگ آئی تھی۔ اس کے خیال میں ایسا کرنے کے میں گھر والوں کا ہاتھ ہے کیونکہ منزہ اور اس کی ماں ان کی ناپسندیدگی سے واقف تھیں۔ بے جی نے اس کے لیے ایسی لڑکی کا انتخاب کیا تھا جو اعلیٰ عزت دار خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور نہ صرف منزہ سے زیادہ خوب صورت تھی بلکہ خوب سیرتی میں بھی اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ بے جی کی خواہش اس نے ٹھوکر میں اڑا دی تھی اور گھر چھوڑ کر جانا ہی چاہتا تھا کہ ان کے ہارٹ اٹیک اور سیریس حالت نے اس کے تمام حوصلے و اشتعال بھلا دیے اور وہ ان کی زندگی کی بقا کے لیے یہ کڑوا ترین گھونٹ پی گیا اور ساتھ واضح بھی کر دیا تھا کہ وہ لڑکی صرف ان کی ضد کی وجہ سے اس گھر میں آئی ہے۔ وہ اس کو وہ مقام ہرگز نہیں دے گا جو منزہ کا حق تھا اور یہ کہ وہ اس سے کچھ نہیں چھپائے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

لیکن جواباً وریشا کا کمپرومائز اس کے ساتھ ساتھ گھر والوں کا بے حد خیال کرنا، بہت کم وقت میں وہ سب کے دلوں پر راج کر رہی تھی۔ سب کی زبان پر اس کی تعریف و توصیف تھی جو اس کی خواہش کے برعکس تھی۔ وہ اسے لے کر ایبٹ آباد چلا آیا تھا تا کہ اپنی نفرت و ناپسندیدگی کے تمام ترکش سے اسے گھائل کر ڈالے اور وہ بھاگ جائے۔

منزہ نے شادی کے کچھ عرصے بعد ہی اس سے رابطہ کر لیا تھا اور اس انداز سے رو رو کر شادی کرنے کی مجبوری بتائی کہ وہ قائل ہو گیا پھر اسے خبر ملی منزہ کے شوہر کے انتقال کی جو روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہوا تھا۔ اب وہ ایبٹ آباد آ گئی تھی اور اس نے ہی اسے رینٹ پر کاٹیج لے کر دیا تھا۔ اس کے تمام اخراجات اسی کے ذمے تھے۔ وریشا کی مدد کے لیے اس نے ایک بھی ملازم نہ رکھا تھا جب کہ منزہ کی فرمائش پر چار ملازمین رکھوائے تھے۔ منزہ جو دور سے چمکتا سونا نظر آتی تھی قریب جا کر معلوم ہوا وہ تو صرف بدنما لوہے کا ٹکڑا تھا جس پر چمک دار پالش ہوئی تھی اور اب وہ پالش اتری تو خصلت کی بدصورتی پوری عیاں ہو چکی تھی۔ وہ بار بار اس کی طرف بھاگا اور ہر بار پہلے سے زیادہ مایوس و بیزار ہوا تھا۔ راتوں کو دیر تک جاگنا دن ڈھلے بیدار ہونا ان کا معمول تھا۔ اکثر وہ ماں بیٹی کو معمولی معمولی چیزوں پر لڑتے دیکھتا تھا۔ یہ بات اس کے لیے نہایت حیرت و تاسف آمیز تھی کیونکہ ان کے گھر میں یہ انداز نہ تھا۔ بہن تو کوئی تھی نہیں بھابی کو بھی اس نے بے جی، ماں جی کا بے حد ادب و احترام کرتے دیکھا تھا پھر وریشا بھی اس کی بہت عزت کرتی تھی۔

ایسی زبان درازی وبدتہذیبی کا بھی ان کے ہاں تصور محال تھا۔ ہر وقت بنی ٹھنی منزہ رہتی تو آنٹی اس سے بھی دو ہاتھ آگے نظر آتیں۔ ادھیڑ عمر میں تیز کلر کے کپڑوں اور بناؤ سنگھار میں وہ کسی باوقار عورت کے برعکس نظر آتی تھیں۔ پہلے وہ منزہ کو گیٹ سے پک کیا کرتا تھا۔ اب متواتر گھر میں جانا ہوا تو معلوم ہوا وہاں عموماً کسی نہ کسی کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کوئی آنٹی کا کزن تھا' کوئی انکل کے رشتے دار تو کوئی منزہ کا سسرالی عزیز۔ وہ آتے اور دنوں قیام کر کے جاتے۔ اسے ان لوگوں کی آمدورفت بری لگتی تھی مگر مروتاً خاموش رہا تھا اور اس دوران حقیقت کھلتی چلی گئی کہ وہ جس کو پتھر سمجھ کر ٹھوکروں میں رکھ رہا تھا۔ وہ دراصل ایسا نایاب ہیرا تھا جو اس طوطا چشم دور میں ملنا مفقود تھا اور جس کو وہ کل کائنات سمجھے ہوئے تھا وہ خوب صورت سراب کے سوا کچھ نہیں تھی۔

"باسط! کیا ہوا ہے تمہیں؟ آخر کیوں مجھے پریشان کرتے ہو؟ پہلے ظالم سماج ہمارے درمیان حائل تھا۔ اب راستہ صاف ہے تو تم دیر کر رہے ہو۔" وہ اس کے سامنے آئی تھی۔ آتشی سوٹ پر سنہری ایمبرائیڈری والے سوٹ میں نک سک سے تیار خفگی بھرے انداز میں محو گفتگو تھی۔

"تم میری شرائط مانو۔ میں تمہاری خواہش پوری کر دوں گا۔" اس کا انداز مختلف وسپاٹ تھا۔ محبت وجنون سرد پڑ چکا تھا۔

"نووے۔ تم یہ چاہتے ہو میں دھوبن باورچن' بھنگن بنوں تو یہ ناممکن ہے۔ ایسے کام صرف وریشا کر سکتی ہے کیونکہ وہ ایسے گھٹیا کام کر کے تمہیں حاصل کرنا چاہتی ہے۔ تمہاری محبت پانا چاہتی ہے تاکہ تم اجرت کے طور پر اپنی توجہ کے چند سکے اس کے کشکول میں ڈال دو۔ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے ڈیئر۔ میں تمہیں حاصل کر چکی ہوں۔ تمہاری محبت وچاہت تمام کی تمام میرے نام وقف ہے۔ مجھے ایسے کسی تردد کی ضرورت نہیں ہے۔" منزہ اس کی بدلتی دلی کیفیت سے بے خبر بڑی وارفتگی سے گویا تھی اور وہ دل ہی دل میں اپنی پسند پر نادم ہو رہا تھا کہ اس کو پانے کے لیے اس نے کیا کچھ نہ کیا تھا۔

"محبت میں تو بندہ وہی کچھ کرتا ہے جو محبوب کی منشاء ہوتی ہے۔ اس کی پسند وناپسند' شوق وذوق حاصل حیات ہوتے ہیں پھر تمہاری یہ کیسی محبت ہے جو تم گھرداری جیسے مقدس فریضے کو عام سے خطابات دے رہی ہو۔ ہمارے معاشرے میں کامیاب عورت گھریلو عورت کو ہی سمجھا جاتا ہے۔"

"یہ تمہارے منہ میں کس کی زبان بول رہی ہے باسط؟" وہ گڑبڑائی تھی۔

"محبت کی زبان منزہ! اس محبت کی زبان جس کو حاصل کر کے تم نے کھو دیا اور وریشا نے ہمیشہ کے لیے پالیا۔"

منزہ کے منہ سے مارے حیرت کے کوئی آواز نہ نکلی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جو ذرا فاصلے پر موجود تھا مگر دل سے بہت دور محسوس ہو رہا تھا۔

"یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہو باسط! میں تمہاری محبت ہوں۔"

"نہیں۔ تم شاید کبھی میری محبت نہیں رہی بلکہ تم ایسی مصنوعی چمک تھی جو وقتی طور پر مقابل کی آنکھیں بند کر دیتی ہے اور اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ کھرے اور کھوٹے کی شناخت ہو گئی ہے مجھے۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ اب کبھی نہیں ملیں گے اور کبھی اتفاقاً کہیں ملے بھی تو اجنبی بن کر گزر جائیں گے۔"

منزہ دھواں دھواں چہرہ لیے اس کو تک رہی تھی۔ یہ کیا ہوا تھا۔ مہرباں اچانک نامہرباں بن گیا تھا۔ جن گہری خوب صورت نگاہوں میں اس نے اپنے لیے چاہت کے دیپ دیکھے تھے۔ وہاں اب کسی اور کی تصویر تھی۔

"منزہ! محبت قربانی مانگتی ہے۔ چاہت وسعت قلبی وبے لوث خلوص مانگتی ہے کیونکہ ہماری زندگی صرف ہماری نہیں ہوتی۔ ہماری خوشیوں پر صرف ہمارا ہی حق نہیں ہوتا۔ ہمیں اپنوں کے لیے جینا ہوتا ہے۔ ہماری مسرتیں ہمارے اپنے دوبالا کرتے ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ منزہ کی آنکھوں پر پڑا خود پرستی وخود غرضی کا پردہ سرکنے لگا تھا مگر وہ شکست ماننے کو تیار نہ تھی۔

"پلیز باسط! معمولی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا مت دو۔ تم جو کہو گے وہی کروں گی۔ مجھے خود سے جدا مت کرو۔ میں مر جاؤں گی۔" منزہ سچ مچ رو پڑی تھی۔

"آئم سوری منزہ! میں اس بندھن کو پسند نہیں کرتا جو دل سے نہ جڑا ہوا۔ میرے دل نے تب تک وریشا کے وجود کو تسلیم نہ کیا۔ اس کو محسوس نہ کیا جب تک ایک مضبوط تعلق کے ہوتے ہوئے بھی میں اجنبی بنا رہا تھا۔ آج وہ نہ ہوتے ہوئے بھی میرے ساتھ ہے اور تم کہیں نہیں ہو۔" وہ دروازہ بند کر کے پلٹ آیا تھا۔ وہ دروازہ صرف گھر کا نہیں دل کا بھی بند کر آیا تھا اور فیصلہ اچانک نہیں ہوا تھا۔ پرسوں جب وہ بنا اطلاع ان کے گھر پہنچا تو ان ماں بیٹی کو اپنے ان نام نہاد رشتے داروں کے سنگ اس گھناؤنے فعل میں مصروف عمل پایا تھا کہ لمحے بھر کو مارے غیرت کے انہیں قتل کر دینے کے درپے ہوا تھا مگر ملازمہ نے منت سماجت کر کے اسے باز رکھا تھا۔ ملازمہ کا کہنا تھا کہ ان کا کام یہی ہے۔ روز نئے لوگ آتے ہیں۔ منزہ اور اس کی ماں کے اس روپ نے اسے بے جی کی ہر بات سچ ثابت کر دی تھی۔ وہ ملازمہ بھی وہاں مزید کام کرنے پر رضامند نہ تھی۔ وہ تنخواہ دے کر اسے فارغ کر آیا تھا۔ ان میں سے کسی کو خبر نہ ہو سکی۔ یہی وجہ تھی کہ منزہ کو دیکھ کر اس میں کوئی ایسی خواہش نہیں جاگی تھی۔ وہ اس پر اب کوئی جذبہ ضائع کرنے کو تیار نہ تھا۔ محبت رہی نہ تھی نفرت کر کے بھی وہ اس سے کوئی رشتہ قائم کرنے سے گریزاں تھا۔ منزہ سے تعلق توڑ کر وہ بادلوں کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

سیل فون کی بیل نے اسے چونکا دیا۔ گھر سے فون تھا۔ سلام دعا کے بعد کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور وہ حرفِ آغاز سے جو ڈانٹ پھٹکار اور ناراضگی کا اظہار سننے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔ ان کی مسکراتی آوازیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ پھر اگلے ہی پل اس کے اندیشے کی تصدیق ہو چکی تھی جب بھابی کی شوخ رازدارانہ آواز ابھری۔

"خوب انجوائے کر رہے ہو لائف' اتنے دنوں تک میں نے کسی کو کال نہیں کرنے دی کہ تمہارے اور وریشا کی تنہائی میں مخل نہ ہو۔ اس وجہ سے بے جی اور ماں جی نے وریشا سے بات کرنے کی ضد نہیں کی' اور سناؤ کیسا وقت گزر رہا ہے؟ ہمارے انتخاب کی داد نہیں دو گے؟ کیا خوب پسند ہے ہماری..... ذرا پلیز وریشا کو فون دو۔ میں صرف مبارک باد دوں گی کہ بالآخر وہ تم جیسے اڑیل گھوڑے کو نکیل ڈالنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔" بھابی کی شوخیاں عروج پر تھیں۔ ان کا کھنکتا لہجہ اس حقیقت کا گواہ تھا کہ وہ وریشا سے لاعلم ہیں۔ سخت سردی میں وہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ یہ سوچ کر اگر وہ وہاں نہیں گئی تو کہاں گئی ہے؟ پچھلے ماہ اس کے والدین اپنے بڑے بیٹے وبہو کے ہمراہ مسقط چلے گئے تھے اور اس کی بہن بھی دبئی میں مقیم تھی پھر کہاں جا سکتی ہے؟ اس سوال نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ وہ گھومتا ہوا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"باسط..... باسط! تم خاموش کیوں ہو وریشا کو بلاؤ۔" بھابی کی آواز ابھری

"بھابی! وریشا یہاں نہیں ہے۔ دس دن قبل کراچی کے لیے روانہ ہو چکی ہے۔" یہ یقین کر کے کہ بھابی تنہا ہیں وہ کہہ بیٹھا۔ جواباً ان کی بوکھلائی ہوئی آواز تھی۔

"باسط..... یہ کیا کہہ رہے ہو.....؟ وریشا کہہ رہی تھی کہ تم لوگ ہنی مون ٹور پر کاغان' کالام وغیرہ جا رہے ہو۔" باسط سمجھ گیا۔ یہ سب اس نے اس لیے کہا کہ وہ ان دنوں میں منزہ سے شادی کرنے کا ارادہ کر رہا تھا اور اس نے انہیں پریشانی سے بچانے کے لیے یہ سب کیا۔

"بھابی! میں آج ہی کراچی آ رہا ہوں۔ وہاں بیٹھ کر تمام گفتگو بتاتا ہوں۔ میں ابھی گھر نہیں آؤں گا کیونکہ مسئلہ بڑھ جائے گا۔ آپ کسی فرینڈ کا کہہ کر وہاں گلشن والے اپارٹمنٹ میں آ جائیں۔ میں جلد پہنچ رہا ہوں۔"



"اب کہاں ڈھونڈیں اسے.....؟ تم سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے باسط۔ یہ سب کرنے سے قبل کم از کم مجھ سے ہی پوچھ لیتے تو یہ سب نہ ہوتا جو ہوا۔" اسے کراچی آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اس دوران وہ ہر ممکن کوشش کر چکا تھا وریشا کو تلاش کرنے کی اور ناکام رہا تھا۔ بھابی اس کٹھن گھڑی میں اس کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے ہی ڈھونڈ کر رمشہ کا ایڈریس معلوم کیا مگر وہاں سے بھی ناکامی ہوئی تھی کیونکہ جس دن باسط یہاں پہنچا تھا اسی دن وہ کینیڈا کے لیے روانہ ہوئی تھی مگر وہاں کا ٹیلی فون نمبر وہ حاصل نہ کر سکی تھیں۔

"آپ کو پہلے سے معلوم تھا؟" اس کے دھیمے لہجے میں استعجاب تھا۔

"ہاں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات تھوڑی تھی۔ وریشا کا فیملی بیک گراؤنڈ ہم سے چھپایا نہیں گیا تھا کیونکہ وریشا عاقب کی حادثاتی موت کے بعد کسی سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کے خیال میں یہ اس سے منسوب ہونے والے شخص کے ساتھ ناانصافی وجرم تھا کہ جو محبت وہ عاقب سے کرتی تھی۔ اس محبت کا اظہار وہ کسی دوسرے سے کرے۔ یہ اس کی اپنی منطقی سوچ تھی جو گھر والوں کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے ابھی جذباتی عمر ہے۔ کل جب یہ دور گزر جائے گا تو وہ ہاتھ ملتی رہ جائے گی۔ جانے والے جاتے ہیں کبھی نہ لوٹ کر آنے کے لیے۔ پیچھے رہ جانے والوں کو بھی صبر آ جاتا ہے۔ اس کے والدین کو معلوم تھا وہ جلد سنبھل جائے گی۔ اس کے لاکھ انکار ومخالفت کے باوجود انہوں نے اس کی شادی کر دی۔ ادھر تم ماں اور بے جی کے دباؤ میں آ کر شادی تو کر بیٹھے مگر سمجھوتہ نہ کر سکے پھر سب تمہارے سامنے ہے۔ عاقب صرف منگیتر تھا اور تم مجازی خدا۔ ایک طرف تمہارا جیتا جاگتا زندگی سے بھرپور وجود تھا تو دوسری جانب نظروں سے اوجھل منوں مٹی تلے دبا ہوا مردہ وجود۔ زندگی کے طالب زندہ لوگ ہوتے ہیں پھر عورت کی حقیقی محبت شادی کے بعد شروع ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ تم سے وریشا کو ہو گئی تھی۔ خود سوچو اگر وہ عاقب کی محبت میں مبتلا ہوتی تو تم سے فوراً جان چھڑا سکتی تھی۔ تم نے کیا کچھ نہ کیا اس کے ساتھ اور وہ برداشت کرتی رہی۔ صرف اس لیے کہ تم اسے علیحدہ نہ کرو' چھوڑ نہ دو۔"

"بھابی! کیا وہ مجھ سے محبت کر سکتی ہے؟ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی..... میں نے بہت پریشان کیا ہے اسے' بہت تڑپایا' بہت ستایا ہے..... اور..... اور اسے گالی بھی دے ڈالی۔" سرخ آنکھیں' بکھرے بال' پریشان حلیہ ان چند دنوں میں وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا تھا۔

"عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے مگر مرد کے لبوں سے نکلا ایک بے اعتمادی کا جملہ اس کی خودداری وعزتِ نفس کو گھائل کر دیتا ہے۔ وہ ایسی کوئی بات برداشت نہیں کر سکتی جو اس کی روح کو زک پہنچائے۔"

"وہ مجھے ایک دفعہ مل جائے۔ میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔ بدلے میں جو سزا دے گی مجھے منظور ہوگی۔ وہ ایک بار آ جائے۔ میں منا لوں گا اسے کہاں گم ہو گئی ہے۔ ایک بار آواز تو دے مجھے' میں خود اس تک پہنچ جاؤں گا۔" وہ پورے خاندان میں اپنی وجاہت' اکھڑ مزاجی وبددماغی کے باعث مشہور تھا۔ گھر والے بھی اس سے بات کرتے وقت احتیاط کرتے تھے۔ فقط بے جی تھیں جو اس سے متاثر نہ ہوتی تھیں۔ ایک ہفتے سے اسی بددماغ واکھڑ مزاج شخص کو وہ ازحد ملول وافسردہ دیکھ کر رنجیدہ تھیں۔



"بچی! دروازہ بند کر لو۔ پریشان مت ہونا۔ مجھے مارکیٹ سے آنے میں دیر ہو جائے گی۔" بوا نے برقعے کے بٹن بند کرنے کے بعد پلاسٹک کی باسکٹ اٹھائی۔ اسے تلقین

کرتے ہوئے دونوں نقاب چہرے پر گرا کر وہ دروازے سے باہر نکل گئی تھیں۔ اس نے دروازہ بند کر کے پردہ برابر کیا پھر جھاڑو اٹھا کر صحن کی صفائی کرنے لگی۔ صحن کے وسط میں آم کا درخت تھا۔ موسم نہ ہونے کے باعث پھل تو ندارد تھا مگر پتوں سے جلد ہی آنگن بھرنے لگتا اور وہ اسی طرح جھاڑو اٹھا کر صفائی میں جت جاتی تھی۔ جھاڑو دے کر تمام پتے اکٹھا کر کے اس نے ڈسٹ بن میں ڈالے۔ سائیڈ میں لگے نل سے پائپ لگا کر پورا صحن دھو ڈالا۔ وائپر لگانے کے بعد اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں فرش پر بچھی دری کے اوپر سفید براق چاندنی بچھی ہوئی تھی جس کے کناروں میں پھول دار رنگین کپڑوں کے غلاف گاؤ تکیوں پر تھے۔ کمرے کے دوسرے حصے میں نماز کی جگہ تھی اور اوپر ریک میں قرآن پاک رکھا تھا۔ ریک کے ہک سے آف وائٹ تسبیح لٹک رہی تھی جو اندھیرے میں مشعلوں کی طرح چمکنے لگتی۔ روشنی میں اس کا رنگ ایسا ہی رہتا تھا۔

کمرہ صاف تھا۔ وہ صحن کے سائیڈ میں بنے کچن میں آ گئی۔ دوپہر کا پکا ہوا آلو قیمہ موجود تھا۔ اس نے آٹا گوندھ کر رکھ دیا۔ عصر کی نماز سے فارغ ہو کر روٹیاں پکائیں۔ چائے تیار کی تا کہ بُوا کے آتے ہی چائے لے آئے۔ عصر کے بعد مغرب کی نماز سے وہ فارغ ہوئی تو اس کا دل گھبرانے لگا۔ بُوا ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ وہ دیر ہو جانے کا کہہ کر گئی تھیں مگر اتنی دیر کبھی نہیں ہوئی تھی۔

آج سردی بھی زیادہ تھی۔ کوئٹہ کی تیز ہواؤں نے کراچی کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ رات کو تیزی سے پھیلتے دیکھ کر وہ بدحواس تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیا کرے؟ اسی دم باہر کار رکنے کی آواز آئی تھی۔ وہ بھاگ کر دروازے پر رک گئی۔ باہر سے آتی بُوا کی آواز سن کر اس کے بدحواس دل کو تسلی ملی تھی۔

''کہاں چلی گئی تھیں بُوا! یہاں فکر کے مارے میرا برا حال ہو رہا ہے.....؟'' ان کی دستک پر دروازہ کھولتے ہی وہ مخاطب ہوئی مگر ان کی پیشانی اور ٹانگ پر بندھی پٹیوں نے اسے پریشان کر ڈالا۔

''کیا ہوا یہ چوٹیں کیسی ہیں؟'' وہ سہارا دے کر اندر لاتے ہوئے گویا ہوئی۔

''معمولی سی چوٹیں ہیں بچی! سڑک پار کرتے وقت ایک کار سے ٹکرا گئی تھی۔'' وہ پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بتانے لگیں۔

''یہ کار والے بھی سڑک کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے چلاتے ہیں۔'' وہ ان کے سرہانے تکیہ رکھتے ہوئے غصے سے بڑبڑائی تھی۔

''بچی! غلطی میری تھی۔ وہ بے چارہ تو بہت شریف لڑکا تھا۔ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ بڑے اسپتال میں لے کر گیا تھا مجھے۔ منٹوں میں ہزاروں روپے خرچ ہو گئے اس کے۔ پرائیویٹ اسپتال والے کس طرح کھال کھینچتے ہیں۔ میرے منع کرنے کے باوجود کئی ٹیسٹ کروائے۔ ایکسرے الٹرا ساؤنڈ..... کیا کچھ نہ کر ڈالا انہوں نے روپے سمیٹنے کے چکر میں اور وہ بچہ بنا منہ بنائے ادائیگی کرتا گیا۔ دوائیں بھی اتنی مہنگی دی ہیں کم بختوں نے یوں دیر ہو گئی۔'' بُوا جب تک جاگتی رہیں اس لڑکے کو دعائیں دیتی رہیں جس نے ان پر خوامخواہ ہزاروں روپے برباد کر دیے تھے۔ وہ ان کے برابر والے پلنگ پر لیٹی ان کی سادگی پر مسکرا رہی تھی۔

بُوا اپنی چوٹیں اور تکلیف نہیں دیکھ رہیں۔ اس کی سخاوت دیکھ رہی ہیں۔ بڑھاپے کی چوٹ معمولی سی بھی بہت تکلیف دیتی ہے۔ بُوا اس سرد موسم میں اکڑ سی گئی تھیں۔ بخار الگ ہو گیا تھا۔ وہ ان کو ناشتہ اور دوا دے کر محلے کے سپارہ پڑھنے والے بچوں کو سبق دے رہی تھیں جب باہر دروازے کے پاس کسی کار کا ہارن بجا تھا پھر کچھ دیر بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ اس نے اشارے سے بچے کو باہر بھیجا جس نے فوراً آ کر اطلاع دی۔ بُوا سے کوئی ملنے آیا ہے۔ اس کے کچھ کہنے سے قبل بُوا خود لنگڑاتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی تھیں اور اس بچے سے اس نو وارد کو اندر بلوا لیا تھا۔ وہ اس دوران پردے میں ہو گئی تھی۔ مضبوط جوتوں کی ٹھک ٹھک اندر جا کر معدوم ہو گئی تھی۔ وہ پردے سے نکل آئی تھی اور گم صم انداز میں اس چھوٹے سے صحن میں پھیلی کلون کی خوشبو محسوس کر رہی تھی۔ کتنی جانی پہچانی شناسا سی تھی یہ مہک.....

''ہش۔ وہ اس چھوٹے سے گھر میں کیوں آنے لگا۔ وہ تو شاید اپنی محبت کے سنگ زندگی کی حقیقی مسرتیں کشید کر رہا ہوگا۔ شادی کر چکا ہوگا۔'' ان آہٹوں پر مہک پر بہکنے والے دل کو اس نے سرزنش کی تھی اور مہمان کے لیے چائے بنانے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

''آپ نے یہ تکلیف کیوں کی بیٹا! کل کیا کم خرچ کیا ہے مجھ پر جو اب یہ اتنا سامان اٹھا کر لے آئے۔'' بُوا کی باسکٹ کل کار میں ہی رہ گئی تھی جو اب وہ لے آیا تھا۔ مختلف شاپرز سے بھری ہوئی۔ بُوا انکساری سے کہہ رہی تھیں۔

''شکر ہے ماں جی! کوئی فریکچر نہیں ہوا ہے۔ میں تو کہتا ہوں آپ ایک ہفتے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہو جائیں۔ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''جگ جگ جیو بیٹا! میں ٹھیک ہوں پھر اپنی جوان بچی کو کیسے چھوڑ کر جا سکتی ہوں۔'' اس لمحے ایک بچی ٹرے میں دو کپ چائے لائی۔ ایک کپ نہایت ادب سے اس کی طرف بڑھایا اور دوسرا بُوا کو دے کر چلی گئی۔

کافی دنوں بعد چائے کی وہ مہک آئی تھی جس کو وہ ڈھونڈ رہا تھا نہ چاہنے کے باوجود اس نے بے اختیار کپ بچی سے لیا اور لبوں سے لگا لیا۔

وہی گمشدہ ذائقہ تھا۔ ایک کے بعد ایک گھونٹ وہ پیتا چلا گیا کسی ندیدے کی مانند۔ بُوا کا کپ ہاتھ میں تھا اور اس نے کپ خالی کر دیا تھا۔ طمانیت آمیز تسکین رگ رگ میں سماتی چلی گئی۔ بُوا کے بھرے ہوئے کپ پر نگاہ پڑی تو وہ حواسوں میں پلٹا اور شرمندہ سا اٹھ کھڑا ہوا۔

''ماں جی! مجھے دیر ہو رہی ہے۔ آپ ان دواؤں کے ساتھ فروٹ اور جوس ضرور لیجیے گا۔ میں کل آؤں گا آپ کی طبیعت معلوم کرنے۔'' پردے کی اوٹ سے جھانکتی نگاہوں میں بے یقینی و تجسس نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ وہ رات اس کے لیے بہت طویل و بھاری تھی۔ بُوا باسکٹ میں سے شاپر نکال کر اس کا لایا ہوا سامان دیکھ رہی تھیں۔ فروٹ، جوس کے ڈبے، انڈے، مکھن، بریڈ، جیلی، ڈرائی فروٹس، بسکٹس بے حساب سامان تھا۔ بُوا اس کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہی تھیں۔ اس کے خاموش بہتے آنسوؤں سے بے خبر جو اندر ہی اندر سسک رہی تھی۔



ڈرائیور اسے ایئرپورٹ چھوڑ گیا تھا۔ کراچی پہنچ کر وہ سیدھی یہاں چلی آئی تھی۔ بُوا سے اس نے قرآن پاک پڑھا تھا۔ ان کے گھر کے عقب میں قائم یہ کچی بستی اتنے سال گزرنے کے باوجود ایسی تھی۔ نہ یہاں کے حالات بدلے تھے نہ یہاں کے مکینوں کے دل..... چھوٹے چھوٹے کچے پکے گھروں میں رہنے والے۔ یہاں کے لوگوں کے دل بڑے کشادہ و شفاف تھے۔ بُوا کی کوئی اولاد نہ تھی چند سال پہلے وہ بیوہ ہو گئی تھیں۔ میاں ان کے دو دکانیں چھوڑ گئے تھے جن کے کرائے سے اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔ اپنی زندگی انہوں نے شروع سے بچوں کو سپارہ، قرآن پاک پڑھانے کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ کوئی اولاد نہ ہونے کے باوجود ان کا آنگن بچوں سے بھرا رہتا تھا۔ ان کے پاس نہ صرف اس محلے کے بلکہ ان کی وضع داری و نیک نامی دیکھ کر آس پاس کے بنگلوں کے بچے بھی درسِ قرآن لینے آتے تھے

بُوا نے توجہ سے اس کی داستان سنی تھی اور کچھ عرصے صبر کرنے کی تلقین کی تھی۔ آج پورے دو ہفتے بعد اس نے باسط کو دیکھا تھا۔ وہ اسے بہت مختلف و کمزور محسوس ہوا تھا۔ وجیہہ چہرے پر کچھ کھونے کا احساس تھا۔ اضطراب و انتشار اس کی چال سے عیاں تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ ساری رات مختلف سوالوں میں بسر کی۔

وہ دوسرے دن بھی حاضر تھا۔ بہت سارے شاپرز کے ہمراہ۔ بُوا نے سختی سے منع کر دیا کہ انہیں یہ سب پسند نہیں۔

اس دن وہ دو کپ چائے بے پی کر گیا۔ ہاتھ میں ٹافیوں، چاکلیٹس کے پیکٹ لیے بُوا کو بتایا کہ وہ ان کے شاگردوں کے لیے لایا ہے۔ بُوا کو زبردستی چیک اپ کے لیے اسپتال لے کر گیا۔ بُوا تو اس کی مٹھی میں تھیں ہی پڑھنے کے لیے آنے والے بچوں کو بھی وہ گرویدہ بنا چکا تھا۔ اس کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ بُوا کے منع کرنے کے باوجود وہ ہاتھ میں کچھ نہ کچھ اٹھائے چلا آتا جن میں سر فہرست بچوں کی چیزیں ہوتیں اور جانے سے قبل وہ ان کو کار میں ایک راؤنڈ سیر ضرور کراتا۔ نتیجتاً بچے اس کے آنے کی دعائیں مانگتے اور کار کا ہارن سنتے ہی بھاگتے۔ وریشا کو سمجھ نہیں آ رہی تھی اس کی حد سے بڑھتی بے تکلفی کا مقصد کیا تھا اور وہ کیا یہاں منزہ کو لے آیا تھا؟ اگر لے آیا تھا تو وہ اسے اتنے گھنٹوں تک کس طرح آزاد چھوڑ رہی ہے۔ اس کی آمد و رفت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر بڑھتے سوالوں کی یورش پھیل رہی تھی۔ باسط سے اس کا سامنا ابھی تک نہ ہوا تھا۔ وہ اس کی موجودگی میں باورچی خانے سے باہر نہیں نکلتی تھی۔

اس دوران اتنی بے تکلفی بڑھی تھی کہ وہ اکثر کھانا بھی وہاں کھانے لگا تھا۔

''بُوا! ایک بات کہوں؟'' وہ ان کی چوٹی باندھتی ہوئی سنجیدگی سے بولی۔

''اجازت کی کیا ضرورت ہے ضرور کہو بچی.....'' وہ شفقت سے گویا ہوئیں۔

''وہ..... باسط صاحب..... بہت آنے لگے ہیں..... میرا مطلب ہے میری یہاں موجودگی..... لوگ کیا باتیں نہیں بنائیں گے؟'' وہ جھجکتے ہوئے مدعا بیان کر رہی تھی۔ یہ گھر اس کا نہیں تھا۔ وہ خود یہاں آئی تھی اور وہ کس طرح انہیں پابند کر سکتی تھی کسی کو بلانے پر۔

''میں جانتی ہوں بچی! تم جو کہنا چاہ رہی ہو میں سمجھتی ہوں۔ دیکھو بچی! اول تو وہ لڑکا بہت شریف و نیک ہے۔ میں نے کبھی بھی اس کی نظروں کو ادھر ادھر بھٹکتے نہیں دیکھا۔ میرے سامنے بھی نگاہیں جھکا کر بیٹھا رہتا ہے اور رہی لوگوں کی بات تو لوگ خود اسے پسند کرتے ہیں۔''

''کیوں.....؟'' یہ اطلاع اس کے لیے حیرت انگیز تھی۔

''وہ لڑکا فرشتہ ثابت ہوا ہے ہمارے لیے۔ ایسے مبارک قدم ہیں اس بستی میں پڑتے ہی گویا سب کچھ سنورتا جا رہا ہے۔'' بُوا اس کی تعریفوں کی پوٹلی کھول چکی تھیں۔ ان کی زبان رواں دواں تھی۔

''بستی کے لوگوں کے لیے مسجد تعمیر کروا رہا ہے۔''

''مسجد یہاں پہلے سے موجود ہے پھر.....''

''بہت چھوٹی مسجد ہے۔ رمضان شریف میں لوگوں کو پریشانی ہوتی ہے۔ کئی بے روزگاروں کو ملازمتیں دلوائی ہیں۔ پانی کا مسئلہ حل کروایا ہے اور یہ بستی بھی کچھ عرصے بعد لیز کروا دے گا وہ..... کہہ رہا تھا اعلیٰ حکام سے بات چل رہی ہے۔ جلد ہی مسئلہ حل ہو جائے گا۔'' بُوا سرشار تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی یہ کایا پلٹ کس طرح ہوئی؟ اپنی ذات کے لیے جینے مرنے والا شخص جس کے نزدیک صرف اس کی خوشیاں و خواہش حاصل زیست تھیں، جو دل توڑنے میں مہارت کے درجے پر فائز تھا، جس نے کس طرح ذلیل و خوار کر کے اسے وہاں سے نکالا تھا..... آج کس طرح، کس کی خاطر یہ سب کر رہا تھا جو اس کا شیوہ نہ تھا۔

''میں نے کہا بھی بیٹا! تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟ یہ ہم غریبوں کا دلدر رہے۔ رہنے دو جہاں سالوں سے کچھ نہیں بدلا وہ تم کیوں کر بدل پاؤ گے؟'' بُوا کہے جا رہی تھیں۔

’’وہ بولا اماں جی میں دعاؤں کا متمنی ہوں۔ نیکیوں کا طلب گار ہوں میں یہ سب اس لیے کر رہا ہوں کہ مجھے کسی کی تلاش ہے۔ میرا کچھ کھو گیا ہے۔ آپ دعا کریں میں اسے پالوں گا۔ میری کوئی چھوٹی سی نیکی ساحلِ مراد تک پہنچا دے گی۔‘‘ وریشا کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ بولی۔

’’بوا! آپ نے پوچھا نہیں ایسی کیا چیز ہے جس کی انہیں تلاش ہے؟‘‘ اس کے اندر ایک انجانی سی کھلبلی مچی تھی۔

’’دل تو بہت چاہا پوچھوں مگر حجاب آڑے آ گیا۔ یقیناً وہ کوئی خاص اور ایسی چیز ہو گی جو یہاں نہ ملتی ہو ورنہ وہ تو اتنے امیر ہیں کہ مہنگی سے مہنگی چیز خریدنے میں بھی تردد نہ کریں۔‘‘

’’ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے جس کا نعم البدل نہ ہو؟ کیا باسط اور منزہ کے درمیان کچھ ہوا ہے؟ کیا منزہ روٹھ کر کہیں چلی گئی ہے جس کی تلاش میں وہ سرگرداں نیکیاں کر رہے ہیں۔ دعائیں سمیٹ رہے ہیں...... دل میں کسی خوش فہمی کو جگہ مت دو وریشا۔ تم کتنی نادان‘ کتنی کوڑھ مغز ہو۔ ہر بار اس شخص کی زیادتیاں بھلا کر اس سے اچھائی کی توقع کرتی ہو...... وہ تمہاری تلاش میں نہیں ہے۔ اسے تمہاری جستجو نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اسی وقت تمہاری یہاں موجودگی محسوس کر لیتا جس طرح تم نے اس کے قدموں کی آہٹوں سے ملبوس کی مہک سے اسے پہچانا تھا۔‘‘ وہ خود سے الجھ رہی تھی۔ بوا کے لب مسلسل حرکت میں تھے۔

’’میں سوچ رہی ہوں بیٹی! باسط میاں سے تمہارے خاوند کا پتہ کرواؤں۔ کیا نام ہے تمہارے خاوند کا...... کبھی تم نے بتایا نہیں......؟‘‘

’’چھوڑیں بوا! کیوں کسی کو پریشان کرتی ہیں۔ ان کو آنا ہو گا تو خود ہی آ جائیں گے۔‘‘ وریشا نے گول مول جواب دیا۔

’’معاف کرو بیٹی! اگر تمہارا خاوند غلط ہے تو آدھی غلطی تمہاری بھی ہے۔‘‘

’’یہ کیا بات ہوئی بوا! میں نے صبر کیا۔ برداشت کیا یہ میری غلطی ہے؟‘‘ نہ معلوم کس احساس تلے وہ روہانسی ہو گئی۔

’’ہاں۔ جب وہ دوسری عورت کے متعلق باتیں کرتا تھا تو تم نے کیوں اسے روکا نہیں؟ کیوں خاموشی سے راستہ صاف کرتی چلی گئیں؟‘‘

’’ہم زبردستی کسی کو محبت کرنے پر مجبور کس طرح کر سکتے ہیں؟‘‘

’’وہ کوئی غیر نہیں۔ تمہارا خاوند ہے۔ میاں بیوی کے درمیان غیریت نہیں ہوتی۔ وہ پیچھے ہٹتا تھا تم آگے بڑھ جاتیں توڑ دیتیں اپنے جھوٹے غرور کو۔ مرد ہمیشہ سے خوب صورتی و حسن کا اسیر رہا ہے۔ اگر تم ایسی بے وقوفی نہ کرتیں تو وہ کب کا اس عورت کو بھول کر تمہارا بن چکا ہوتا۔‘‘ بوا اب اسے سبق پڑھا رہی تھیں۔

’’اس نے مجھے گھر سے نکالا‘ گالی دی‘ میرے کردار پر شک کیا۔ یہ سب میں کس طرح بھول سکتی ہوں بوا۔ ایک عورت کا اصل زیور اس کا کردار ہوتا ہے۔‘‘ وہ بے اختیار رونے لگی۔ بوا نے اسے سینے سے لگایا‘ سمجھایا پیار کیا پھر بولیں۔

’’میں جانتی ہوں یہ سب برداشت کرنا بہت مشکل ہے مگر میری بیٹی! ایسا سوچنے کا بھی تم نے ہی موقع دیا۔ خیر جو ہونا تھا ہو گیا مگر میرا دل کہتا ہے وہ پلٹ کر ضرور آئے گا اور اس کی سزا یہ ہو گی کہ تم اسے معاف کر دینا۔ اس کا ضمیر اسے تاحیات تمہارے آگے نگاہ نہ اٹھانے دے گا۔‘‘

سپارہ پڑھنے والے بچے سلام کرتے ہوئے اندر آ گئے تھے جن کے لیے اس نے پہلے صحن میں دری بچھا دی تھی۔ وہ چپلیں ایک طرف اتار کر دری پر بیٹھ گئے تھے۔ پیچھے وہ چلا آیا۔ بہت سارے غبارے اور چاکلیٹس لیے ہوئے۔ اس نے بچوں میں ٹافیاں اور غبارے تقسیم کرنا شروع کر دیے تھے۔ بچوں کے چہروں پر خوشی دیدنی تھی اور وہ پردے کی اوٹ سے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھ رہی تھی جہاں بے سکونی و اضطراب ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ بوا اسے اندر لے گئی تھیں پھر الٹے قدموں ہی واپس آ گئی تھیں۔

’’شامی کباب تیار ہو گئے؟ باسط میاں کہہ رہے ہیں بڑی لذیذ خوشبو آ رہی ہے۔‘‘ بوا اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

’’ہاں تیار ہیں۔‘‘ کباب پلٹتے ہوئے بولی۔

’’تم اتنے میں رائتہ بنا لو میں پراٹھے بنا لیتی ہوں۔‘‘

’’وہ پراٹھے نہیں کھاتے۔ میں بریڈ سینک دیتی ہوں۔‘‘ اس نے بے ساختہ کہہ دیا۔ چور نگاہوں سے بوا کی جانب دیکھا تو وہ اپنے آپ میں گم تھیں۔

’’تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس دن بھی انہوں نے پراٹھا نہیں کھایا تھا۔ جلدی سے تیار کر کے بھیج دو اندر۔ یہ میرے نصیب ہیں۔ پہلے تم جیسی لڑکی نے میری کٹیا کو محل بنا دیا۔ اب باسط میاں نے اتنی عزت دے کر سرخرو کر دیا ہے۔ محلے میں سب مجھے رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔‘‘ شدتِ جذبات سے ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ وریشا نے بڑی عقیدت سے ان کے آنسو صاف کیے تھے۔

باسط بڑی حیران کن نگاہوں سے اپنے آگے رکھے اس ٹرے کو دیکھ رہا تھا جس میں پلیٹوں کے اندر کباب‘ سلائس‘ چپس اور کیچپ ایک مخصوص انداز سے رکھے تھے اور یہ انداز ان مخصوص ہاتھوں کا تھا جو کھو گئے تھے۔ بوا اسے کھانے کی تلقین کر کے صحن میں بچوں کا سبق سننے چلی گئی تھیں۔ وہ کھاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ بوا کی بیٹی اور وریشا کی نیچر یکساں لگتی ہے۔ خاموش رہنا‘ گھر چمکا کر رکھنا‘ کھانے لذیذ بنانا‘ اسے یہاں آتے ہوئے کئی دن گزر گئے تھے۔ نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ وہ اس چھوٹے سے گھر کی جانب کھنچا چلا آتا تھا۔ یہاں آ کر اس کے مضطرب دل کو طمانیت ملتی تھی۔ کھویا ہوا قرار ملنے لگتا تھا۔ دل و دماغ پر چھائی وہ مانوس سی خوشبو ان کچی پکی در و دیواروں سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس کا دل کہتا وہ یہیں کہیں ہے۔ اس کی خوشبو‘ اس کی خاموشی اسے صدائیں دیتی تھیں اور وہ سب بھول بھال کر کشاں کشاں یہاں بھاگا چلا آتا اور سب بھول جاتا تھا۔

بوا کی سادگی و مروت سے بھرپور باتیں اسے اچھی لگتیں‘ پڑھنے والے بچوں سے وہ خاصی حد تک فری ہو گیا تھا۔ بچوں کے ساتھ شرارتیں کر کے وہ خود میں جینے کی امنگ پیدا کرتا تھا۔ ابھی سمیع اس سے سیل فون لے کر گیا ہوا تھا۔ وہ اس کے کیمرے سے آم کے پیڑ پر آنے والے پرندوں کی تصویر کھینچتا تو کبھی دیوار پھاندتی بلی اس کے کیمرے کی زد میں آتی تھی۔

وریشا کی تلاش میں ناکامی کے بعد بھابی نے کہا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ نیکیاں کرے‘ مجبور بے بس لوگوں اور معصوم بچوں کی دعائیں لے کیوں کہ نیکی کبھی ضائع نہیں جاتی‘ دعائیں کبھی نہ کبھی ضرور قبولیت کا درجہ پاتی ہیں تب سے اس نے لیے بہت سے فلاح و بہبود کے کام شروع کر دیے تھے۔

’’انکل بہت ساری تصویریں لے کر آیا ہوں۔‘‘ چھ سالہ سمیع خوشی خوشی اندر آ کر اس سے گویا ہوا تھا۔

’’اچھا...... یہ ٹرے باہر دے کر آؤ پھر تصویریں دیکھتے ہیں۔‘‘ وہ سیل فون اس کے ہاتھ سے لے کر ٹرے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ سمیع ٹرے لے گیا۔ وہ تصویریں دیکھنے لگا۔ آڑی ترچھی تصویریں صحن میں بیٹھے بچے نمایاں تھے۔ کچھ تصویروں میں بوا بھی موجود تھیں پھر ایک تصویر پر اس کی نگاہیں اٹھی کی اٹھی رہ گئیں۔ وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت سمیع اندر داخل ہوا تو وہ پوچھنے لگا۔

’’بیٹا! یہ...... یہ کون ہیں؟‘‘ اس نے موبائل کی اسکرین پر انگلی رکھ کر کہا۔

’’یہ باجی ہیں۔ میں نے چھپ کر یہ تصویر لی ہے۔ یہ آپ کو دیکھ کر پردے میں چھپ جاتی ہیں۔ بوا کو آپ نے دیکھا ہے۔ باجی کو نہیں دیکھا اس لیے۔‘‘ سمیع کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی وہ وہیں چاندنی پر سجدے پر گر گیا تھا۔

اس کی نیکیاں رائیگاں نہیں گئی تھیں۔ اس رب کریم نے اپنی رحمتوں کی بارش اس پر اس انداز میں کی تھی کہ جلد دعائیں مقبول ہوئی تھیں۔ سمیع اسے اس طرح سجدے میں دیکھ کر سمجھا کہ وہ گر گیا ہے۔ وہ بھاگ کر بوا کو بلا کر لے آیا۔ ہانپتی‘ کانپتی بوا گھبرا کر اندر آئی۔ ان کے پیچھے تمام بچے اور بچوں کے پیچھے خوفزدہ سی اڑی اڑی رنگت والی وریشا تھی۔ وہ سجدے سے اٹھ گیا تھا۔ اشکِ ندامت اس کی آنکھوں میں تھے۔ بچوں کو بوا نے چھٹی دے دی۔ باسط کے شرمسار و نادم انداز میں حرف داستان سنی اور فیصلے کا اختیار وریشا کے ہاتھ میں دیا تھا۔

کمرے میں گمبھیر خاموشی تھی۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ باسط اسے منانے کے لیے حکایت دل سنانے کے لیے لفظوں کو ترتیب دے رہا تھا اور وہ گردن جھکائے آنسو بہا رہی تھی۔

’’وریشا!‘‘ اس نے محبت سے مخمور نگاہیں اس کے صبیح چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہی تھی۔

’’جو ہمارے ساتھ گزرا وہ کبھی تاحیات ہماری زبان پر نہیں آئے گا۔ اس وقت کو ایک ڈراؤنا سپنا سمجھ کر بھول جاؤ۔ میں نے جو تمہارے ساتھ کیا اسے اگر معاف کر سکتی ہو تو کر دو...... ورنہ میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔‘‘ وریشا خاموش رہی تو وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

’’جانتا ہوں۔ میرا جرم قابلِ معافی نہیں ہے۔ میں نے بہت کم ظرفی و بے حسی کا ثبوت دیا تھا مگر تم سے دوری اور تمہاری تلاش نے مجھ سے بھرپور انتقام لیا ہے۔ لمحہ لمحہ تڑپایا ہے۔ تم بے جی کے پاس کیوں نہیں گئیں؟ اگر تقدیر ہمیں اس طرح نہ ملاتی تو...... یقین مانوں میں زندہ نہیں رہ پاتا۔‘‘ اس کی نگاہوں میں محبت کی صداقت تھی۔ پھر محبت تو بذاتِ خود ایسا جذبہ ہے جو اپنا آپ منوا کر چھوڑتا ہے۔ وہ اس کے جذبوں تک رسائی حاصل کر چکی تھی۔ اب اس کی چاہت کی چاندنی صرف اس کے لیے تھی۔ ساری خفگی و کدورت صاف ہو چکی تھی۔ اس کے لبوں پر برسوں بعد وہی زندگی سے بھرپور مسکراہٹ عود کر آئی تھی جس نے اس کے چہرے کو پورے وجود کو منور کر ڈالا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا۔ اب وہ دادی جان کی دعاؤں کے حصار میں آ گئی تھی۔ رونے کے دن گزر گئے تھے۔ اب ہنسنا تھا۔

’’میں ہر سزا پانے کو تیار ہوں۔ پلیز مجھے معاف کر دو وریشا۔‘‘

اس کی خاموشی اسے متوحش کر رہی تھی۔

’’بیٹی! اگر صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے تو دروازے کھول دیتے ہیں‘ تکرار نہیں کرتے‘ مان جاؤ‘ معاف کر دو۔ بھلا معافی سے بڑھ کر اور سزا کیا ہو گی قصوروار کے لیے۔‘‘ بوا اندر آ کر گویا ہوئیں۔

’’بوا! آپ میری طرف ہیں یا ان کی طرف؟‘‘

’’وہ کہتے ہیں نہ ففٹی ففٹی۔‘‘ بوا کے انداز پر تینوں کے قہقہے گونج اٹھے تھے۔

